ترمیم شدہ

دہلی کی آخری شمع

یعنی

۱۲۶۱ سنہ ہجری مطابق ۱۸۴۶ سنہ عیسوی میں

دہلی کا ایک یادگار شاہی مشاعرہ

بعہد بہادر شاہ ظفر

از

جناب مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب بی اے دہلوی

مع اضافہ مقدمہ و قدیم اساتذہ کی اصلاحیں

ادبی لطائف و ظرائف و شاعری کی حقیقت وغیرہ

پبلشرز

ایجوکیشنل بک ہاؤس

بک سیلرز اینڈ پبلشرز

سول لائن شمشاد مارکیٹ علی گڑھ

سنہ ۱۹۵۰ء (کمال پرنٹنگ پریس دہلی) قیمت [illegible]

فہرست

مشاعرہ کا اختراع و ایجاد

مقدمہ

مشاعرہ کی جو ترکیب آج تمام ہندوستان میں دیکھی جاتی ہے اس کی ابتدائی صحیح تاریخ کتابوں میں نہیں ملتی۔ فارسی تذکروں سے اتنا پتا چلتا ہے کہ مختلف زمینوں میں شعر خوانی کے لئے جہاں چند شعرا جمع ہو جاتے تھے اس صحبت کو مشاعرے کے نام سے منسوب کیا جاتا تھا۔ آج کل کی طرح اس نشست میں کسی خاص قافیہ و ردیف کی قید اور مصرع طرح کی پابندی سے غزلیں نہیں پڑھی جاتی تھیں بلکہ ہر شاعر اپنی پسند سے اپنے منتخب اشعار سنا کر سخن آفرینی کی داد لیا کرتا تھا۔

اکثر معاصرین شعرا کی بعض غزلیں ایسی پائی جاتی ہیں جو ایک ہی طرح میں کہی گئی ہیں، ان کو دیکھ کر شبہ کیا جا سکتا ہے کہ ان شاعروں نے بیک وقت آج کل کی طرح اوّل سے کوئی مخصوص مصرع مقرر کر کے طبع آزمائی کی ہوگی، لیکن کسی تذکرے میں ایسی ہم طرحی انجمن کے انعقاد کا ذکر نہ ہونے سے اس شبہ کو تقویت نہیں ہوتی۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ ایک معاصر کی غزل سن کر دوسرے ہم عصر نے اسی قافیہ و ردیف میں غزل کہی ہو جیسے آج ہم ایک وقت کی ذکر کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ متقدمین کے اتباع میں متاخرین کی بھی ہم طرح غزلیں ہیں، ان پر بھی مشاعرے کا اطلاق نہیں ہو سکتا۔

موجودہ طرز مشاعرہ کا اختراع و ایجاد ہندوستان کے اردو شعراء

کی جدت آفرینی کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے اور وہ بھی ولی، حاتم، آبرو اور آرزو کے بعد میر تقی میر اور ان کے بعد اکثر تذکروں میں ایسی محفل مشاعرہ کا مذکور پایا جاتا ہے۔ چنانچہ نکات الشعرا میں میر نے اپنے مکان پر مہینے میں دو مرتبہ مشاعرے کے منعقد کئے جانے کا تذکرہ کیا ہے۔ نیز خواجہ میر درد کی خانقاہ میں بھی شعرا کا اجتماع اور شعر و سخن کے جلسے یادگار زمانہ ہیں۔ ان کے بعد لکھنؤ میں مشاعروں کے چرچے اور انشا، مصحفی، ناسخ و آتش کے معرکے، دہلی میں شاہ نصیر، معروف، مومن، ذوق اور غالب کی صحبتیں ادب اردو کی تاریخ جاننے والوں پر مخفی نہیں مولوی کریم الدین نے رجب ۱۲۶۱ھ کے یادگار مشاعرے کا جو تذکرہ لکھا ہے آج تک زبان زد روزگار ہے، مشاعرہ کیا بلکہ مساعرہ تھا۔ اس مشاعرہ کے دیکھنے والے اب کہاں!

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں کیا عام و عوام اور کیا خاص و خواص کیا امرا، کیا فضلا سب کے سب اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے اور ہر گوشے میں یہی بساط سخن بچھی ہوئی نظر آتی تھی ان اساتذہ کے بعد داغ و امیر اور ان کے معاصرین کا دور آتا ہے جن کی معاصرانہ اور حریفانہ معرکہ آرائیوں سے ایک عرصہ تک رامپور و حیدرآباد کی صحبتیں گرم رہی ہیں مشاعرے کے اس ایک صد سالہ دور نے ایسی صحبتوں اور جلسوں کو ایک مخصوص تقریب کی صورت میں قائم کر دیا ہے جس طرح محرم کی مجلسوں اور میلاد کی محفلوں کو اشتہار اور اعلان کی ذریعے سے مرجع انام بنایا جاتا ہے اسی طرح بلکہ اس سے زیادہ خاص و عام اس صحبت سے دلچسپیاں حاصل کرتے ہیں۔ ہمارے زمانہ میں بھی یہ دستور کم و بیش تمام ادبی حلقوں میں

پایا جاتا ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ آج کل کے مشاعرے ایک طرف تو فریق بندیاں، جنبہ داری، حسد پروری کا شکار ہیں اور دوسری طرف بدمذاقی، خفیف الحرکاتی اور خود پرستی کا ہدف۔ یہ حقیقت اگرچہ تلخ ہے مگر محض اس بنا پر کہ تلخ ہے اس کے حق ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے۔ سوداؔ کی ہجو گوئیاں انشاؔ کا تمسخر۔ اسلاف پرستوں کے لئے ضرور محرک عمل اور تقلید کورانہ کے اسباب و علل ہیں۔ یاد رکھنا چاہئے کہ ان خوش وقتوں کی ایسی سخن آفرینیاں تفریحی اور وقتی ہوا کرتی تھیں اور جو کچھ وہ زبان سے بیان کیا کرتے تھے اس کا اثر بغض و حسد بن کر دلوں میں جاگزیں نہیں ہوتا تھا۔ اسی کے ساتھ ایسے مطائبات و طنزیات میں بھی فن سخن کے لئے اتنے فوائد و نکات چھوڑ جاتے تھے جن کے ذریعہ سے اہل ادب کو معلومات کا کافی سرمایہ ہاتھ آجاتا تھا۔

شاعری کی تعریفیں مشرقی اور مغربی اہل ادب نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق مختلف عنوانوں سے کی ہیں جن میں بکثرت تضاد و تخالف نظر آتا ہے باایں ہمہ اس کی لطف اندوزی اور دلکشی سے کسی کو انکار نہیں۔ مجھے سب سے زیادہ جو تعریف پسند ہے وہ اس پرانے ہندی مقولے میں مضمر ہے یعنی "رائی کو پربت بنانا"۔ اس لطیف استعارے کو موجودہ مذاق کے مطابق ان الفاظ میں ادا کیا جا سکتا ہے کہ "شاعری درحقیقت ایک خوردبین ہے جس میں چھوٹی چیزیں بڑی بن کر نظر آتی ہیں۔ اس کو لوگ مبالغہ کہتے ہیں لیکن وہ مبالغہ نہیں بلکہ اس خوردبین کا اثر ہے"۔ اس خیال کے باور کرنے میں کوئی شبہ نظر نہیں آتا کہ شاعری یقیناً ایک موہبت عظمیٰ ہے۔ جس طرح انسان کو دوسری ظاہری و باطنی قوتیں ودیعت کی گئی ہیں ہو بہو اسی طرح ہر فرد بشر کو ملکۂ شاعری عطا کیا گیا ہے

ہر ذی روح کتمِ عدم سے اپنے تمام جوارح و اعضا کے ساتھ دنیا میں آتا ہے اور پیدا ہوتے وقت صوتِ محض کے سوا کسی قوت کو بروئے کار لانے کی قابلیت نہیں رکھتا۔ لیکن گھنٹوں، دنوں، ہفتوں، مہینوں اور برسوں کے ختم ہوتے ہوتے باصرہ، ذائقہ، لامسہ، سامعہ، ناطقہ، ماسکہ، شامّہ، حافظہ، مدرکہ غرض کہ تمام حسیات کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے۔ اگر کوئی مرض لاحق نہ ہو جائے اور اہلِ مقدور اپنی قوتوں کو ان کے مقدرات کے مطابق معطل نہ رکھے تو یہ تمام احساسات حسبِ حیثیت اپنے ارتقائی مدارج طے کرتے رہتے ہیں اور جن جن قوتوں کی مشق جاری رہتی ہے وہ روز افزوں ہوتی رہتی ہیں۔ غالباً ان اشاروں کے بعد کسی صراحت یا تمثیل کی حاجت نہ ہوگی۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ہاتھ، پاؤں، آنکھ، کان جس کام کے لئے بنائے گئے ہیں، اگر ان سے وہ خدمات نہ لی جائیں تو ان کا وجود تو باقی رہتا ہے مگر کالعدم۔ یہی کیفیت ملکۂ شعر کی ہے کہ وہ ہر ذی روح میں موجود ہے لیکن اپنی جہالت اور ناواقفیت یا عدمِ اطلاع سے اگر اس کو متحرک نہ کیا تو یہ صرف ہماری بے حسی ہے نہ قدرت کی بے فیضی۔

یہ بات بھی خصوصیاتِ فطرت میں داخل ہے کہ جس قوت سے جس مقدار میں کام لیا جائے گا اسی قدر اس میں کمی و بیشی ہوتی رہے گی۔ اعضاء و قویٰ کے مکمل ہونے سے پہلے مکمل اعضاء کی طرح اگر ان سے کام لیا جائے گا تو وہ بہت جلد بے کار ہو جائیں گے یا مکمل ہونے کے بعد مقدار سے زیادہ خدمت سپرد کی جائے گی تو کسی نہ کسی عارضے میں مبتلا ہونا پڑے گا۔ لیکن انھیں قوتوں کو اگر معین اور معتدل حالت میں

رکھکر مشق کرائی جائے گی تو قوائے انسانی میں نہ صرف پائداری اور
اور استقلال کی شان پیدا ہوگی بلکہ دوسرے ہم جنسوں کے مقابل ایک
امتیازی حیثیت اور ممتاز شخصیت قائم ہوسکے گی جس کی بدولت وہ
اپنے فن خاص میں سربرآوردہ شمار کیا جائے گا۔

فنون لطیفہ جن میں شاعری بھی شامل ہے انسانی تمدن معاشرت
کے لحاظ سے اکتساب و استعمال کے لائق ہیں۔ مگر نہ ایسے جن پر زندگانی
معاشرت کا انحصار ہو۔ البتہ جس طرح کسی محنت و انہماک کے بعد آرام
سکون لازمی ہے۔ اسی طرح اس تسکین و راحت کو پُر لطف بنانے کے لئے
ایسے تفریحی مشاغل ضروری و مفید مانے جاتے ہیں۔ ان مشاغل کے لئے
سب سے پہلے مناسبت طبیعت اور ملکہ و استعداد کی ضرورت ہے۔
اسی کے بعد جس طرح اصلی فولاد کے جوہر صیقل و جلا سے نمایاں ہوتے ہیں
اسی طرح اکتساب و مشق کے ذریعے سے قوائے ذہنی کو ترقی حاصل
ہوتی ہے۔ حلق و حنجرہ۔ زبان و دہن ان سب کی مجموعی ترکیب، تخلیق مختلف
آوازوں کا مخرج اور آلہ ضرور ہے۔ مگر ترنم و نغمہ سرائی کے لئے
جب تک فن موسیقی حاصل نہ کیا جائے گا ان آوازوں میں کوئی دلکش
ترتیب پیدا نہیں ہو سکتی۔

میرا مطمح نظر شاعری کے متعلق یہ ہے کہ شاعری جس کو بجا طور پر مصور
کائنات کہا جاتا ہے اس کی قابلیت غیر محدود ہونی چاہیے جس قدر قابلیت
وسیع اور نظر بلند ہوگی اسی قدر ایک دقیقہ رس طبیعت بآسانی
معنی یاب ہو سکے گی۔

مشرقی شاعری میں پابندی قوافی اور بعض اصولی خصوصیات کا

انحصار وقت طلب ضرور ہے۔ لیکن یہ پابندیاں اسی لئے لازم کی گئی ہیں کہ خواص شعر کے سوا عوام کی ہوسناکی اس فنِ لطیف کو سخیف نہ بنا سکے تاریخی ورق گردانی کے بعد جب قدر اسلاف پر نظر ڈالی جائیگی تو قدیم شعرا میں سخن پرست تو بے شمار نظر آئیں گے مگر سخن گو معدودے چند ہی ہوں گے۔ بخلاف عہد متاخرین کے کہ شعرا کی تعداد بڑھتے بڑھتے حد سے تجاوز ہو گئی ہے۔ اس افراط و تفریط میں بھی نکتہ ہے کہ جب تک شاعری ان افراد کے لئے مخصوص رہی جو جامع العلوم تھے اس وقت تک شعر کی تعداد نہایت موزوں حد تک قائم رہی اور جب کم علم شعرا نے بھی آزادی سے یہ پابندی اختیار کی تو شاعری کی منزلِ مقصود قافیہ پیمائی تک محدود ہو گئی۔ یہ کیفیت اس وقت کی ہے جب کہ قافیہ و ردیف، صنائع و بدائع اور استعارہ و تشبیہ غرض کہ تمام قیود و ضوابط کا التزام بطور فرض و واجب کے تھا۔ اب کہ مشرقی علوم و فنون کی ورق گردانی برائے نام امتحانوں کے گھنٹوں تک رہ گئی ہے شاعری کی پرانی بندشوں کو توڑ کر موجودہ شعرا کو اور زیادہ مطلق العنان بنا دیا گیا ہے۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ اگر عصر حاضرہ کی غیر مفید شاعری بھی قدما کی طرح مخصوص حیثیت اور نمایاں شخصیت والوں کے لئے RESERVE (محفوظ) رہے تو یقیناً اردو کے لئے طرۂ امتیاز ہے۔ ورنہ بقول مرزا غالب کے "ایسی شاعری سے گھنٹہ کہنا بہتر ہے۔"

بعض سخن سنجانِ حال کی نغمہ سرائیوں میں فارسی و عربی کے
نامانوس الفاظ اور ان کی مختلف النوع غلط ترکیبیں بکثرت پائی جاتی
ہیں اور محض اس آمیزش و افزائش کی وجہ سے اس منظوم کو عام
مستمعین میں بعض اوقات شرف خاص حاصل ہو جاتا ہے لیکن
درحقیقت یہ تحسین ناشناس کوئی وقعت نہیں رکھتی۔ ایسی سخن آفرینیوں
کو اصلاح عوام میں بلیغ کہا جاتا ہے، جس کو اہل نظر فن بلاغت کی
توہین سمجھتے ہیں۔ علم بیان و معانی میں فصاحت و بلاغت لازم و ملزوم
ہیں یعنی فصاحت بغیر بلاغت کے بازاری بول چال ہے اور بلاغت
بغیر فصاحت کے مہمل۔

ان خیالات سے ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو یہ اشتباہ پیدا ہو کہ
ہم سرے سے اردو زبان کی توسیع یا خیالات کی اصلاح کے مخالف
ہیں۔ حاشا و کلّا ہمارے نزدیک اگر اردو کو علمی زبان بنانا ہے
اور اس میں ہر قسم کے خیالات ادا کرنے کی صلاحیت پیدا کرنی ہے
تو بغیر تجدید و توسیع چارہ نہیں۔ لیکن واضح رہے کہ اس تجدید کی بھی
تجدید ضروری ہے، ورنہ یہ خواب توسیع طلب کثرت تعبیر سے
بہت زیادہ پریشان کن ثابت ہوگا۔ اس مقصود کے تحفظ کے لئے
ضرورت ہے کہ اردو کے اہل ادب وقتاً فوقتاً باہم مجتمع ہوں اور
زبان کی اصلاح اور ترقی کی تدابیر پر غور کریں۔ اس قسم کی کوششیں
انفرادی حیثیت سے مقبول نہیں ہو سکتیں۔

انھیں اجتماعی صورتوں میں سے ایک صورت کا نام "مشاعرہ"
ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ چند سخن گو اور سخن سنج اصحاب جمع ہو کر

اشعار سنیں اور سنائیں اور برمحل تحسین اور حسب موقع نکتہ چینی سے زبان کی اصلاح اور مذاق کی درستی کی خدمت انجام دیں جسے اردو زبان کی ترقی کا ایک ممتاز رتبہ حاصل ہے اور یہ کہنا کچھ بے جا نہ ہوگا کہ یہی وہ علمی و ادبی مجلسیں تھیں، ہیں اور رہیں گی جو زبان و ادب کی صحیح معنوں میں خدمت گزار ہیں۔

احسن مارہروی
اردو لیکچرار مسلم یونیورسٹی
علی گڑھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

تعارف

۱۲۶۱ھ کا وہ یادگار مشاعرہ جو ابوظفر بہادر شاہ تاجدار دہلی کے عہد میں باہتمام مولوی کریم الدین صاحب ہوا تھا مرزا فرحت اللہ بیگ صاحب دہلوی نے نہایت قابلیت کے ساتھ اپنی مقبول طرز نگارش میں قلم بند کیا ہے جس کے مطالعے سے اُس عہد کا مذاقِ شعر و ادب اور قلعۂ معلی کی بعض خصوصیات معاشرت کا اندازہ اس طرح ہوتا ہے جس طرح چشم دید حالات و واقعات معلوم ہو سکتے ہیں۔

کارکن مشاعرہ کی شخصیت، شاہانہ مشاعرہ کی اہلیت، ظلِ سبحانی تک رسائی، بادشاہ سلامت کا اندازِ تکلم، قلعۂ معلی کی سیر، شعرائے دہلی کو دعوت شرکت دینا، ہر ایک کے مکان پر جانا، ہر شاعر کی طرزِ زندگی و خصائل و عادات کا معلوم ہونا، آپس کی نوک جھوک، شعرا کی آمد کا منظر، مشاعرہ کی ابتدا، شعرا کا اندازِ بیان اور نمونۂ کلام، تنقید و تبصرہ، طریق نشست وغیرہ ایسے دل کش پیرائے میں تحریر ہیں کہ بالکل یہ معلوم ہوتا ہے جیسے تمام واقعات اپنے سامنے ہو رہے ہیں اور بچشم خود اس مشاعرہ کو دیکھ کر ماہ و سال سے دورِ ماضی کے لطف اٹھا رہے ہیں جس میں شاہ و شاہزادگان والا تبار اور شاعرانِ دربار یکتائے روزگار کی خوبیاں قابلِ دید لائقِ داد ہیں۔ دلچسپی کے علاوہ معلومات میں بھی اضافہ ہوگا۔

راقم احسن مارہروی

اردو لیکچرار مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اُردو کے محسنِ اعظم جناب مولانا ڈاکٹر عبدالحق صاحب بی اے فرماتے ہیں

"بعض بعض اصلاحیں جو قدیم اُستادوں کی دستیاب ہوئی ہیں وہ ہماری شاعری میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھی جائیں گی"

۱۲۶۱ھ میں دہلی کا ایک یادگار مشاعرہ

۱۔ تمہید

نامِ نیکِ رفتگاں ضائع مکن
تا بماند نامِ نیکت برقرار

بقول غالبؔ مرحوم انسان "ایک محشرِ خیال" ہے لیکن خیال میں حشر بپا ہونے کے لئے کسی بیرونی تحریک کا ہونا لازمی ہے۔ دماغ خیال کا گنجینہ ہے، لیکن اس گنجینے کے کھلنے کے واسطے کسی ظاہری اسباب کی کنجی کی ضرورت ہے۔ مجھے بچپن سے شعرائے اردو کے حالات پڑھنے اور سننے کا شوق رہا ہے مگر کبھی کوئی ایسی تحریک نہیں ہوئی جو ان کے حالات کو ایک جگہ جمع کرنے کا خیال پیدا کرتی اور یہ خیالات الفاظ کی شکل میں ظاہر ہو کر ایک خوش نما چلتی پھرتی تصویر بن جاتے۔

جب کوئی بات ہونے والی ہوتی ہے تو اسباب خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں۔ اتفاق دیکھئے کہ پرانے قدیم کاغذات میں مجھکو حکیم مومن خاں مومنؔ دہلوی کی ایک قلمی تصویر ملی، تصویر ملنا تھا کہ یہ خیال پیدا ہوا کہ تو بھی محمد حسین آزادؔ مرحوم کے "نیرنگِ خیال" کی محفل شعرا کی طرح ایک مشاعرہ قائم کر، مگر ان لوگوں کے کلام پر تنقید کرنے کے بجائے صرف ان کی چلتی پھرتی تصویریں ہی دکھا۔ خیال میں رفتہ رفتہ پختگی ہوئی اور اس پختگیٔ خیال نے ایک مشاعرے کا خاکہ پیشِ نظر کر دیا لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ مختلف زبانوں کے شاعروں کو کس طرح ایک جگہ جمع کروں۔ اس عقدہ کو امیر اللہ تسلیمؔ مرحوم کے اس شعر نے حل کر دیا ؎

جوانی سے زیادہ وقتِ پیری جوش ہوتا ہے
بھڑکتا ہے چراغِ صبح جب خاموش ہوتا ہے

اس شعر کا یاد آنا تھا کہ شعرائے دہلی کا آخری دور آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور دل میں یہ بات جم گئی کہ بجائے تمام شعرائے اردو کے دہلی کا آخری دور کا نقشہ کھینچ دیا جائے۔ قاعدے کی بات ہے کہ مرنے سے پہلے بیمار سنبھالا لیتا ہے۔ اردو شاعری کے حق میں بہادر شاہ ثانی کا زمانہ بھی دہلی کا سنبھالا تھا۔ بادشاہت برائے نام تھی اور جو تنخواہ بادشاہ سلامت کو ملتی تھی اس میں قلعے کا خرچ بھی مشکل سے چلتا تھا۔ برخلاف اس کے دکن اور اودھ میں بہت دولت کی گنگا بہہ رہی تھی پھر بھی "دریائے جمنا کی چمکتی ریت" دہلی والوں کے لئے نظر فریب رہی اور اس "اجڑے دیار" میں شعرا ہی نہیں ہر فن کے کاملوں کا ایک مجمع ہو گیا جس کی نظیر ہندوستان تو ہندوستان دوسرے کسی ملک میں بھی ملنی دشوار ہے۔

زمانہ ایک رنگ پر نہیں رہتا۔ ۱۸۵۷ء سے قبل ہی ان کاملین فن میں سے بہت سے تو ملک عدم کو سدھار گئے، جو پیچھے رہ گئے تھے ان کو غدر کے طوفان نے تتر بتر کر دیا۔ جس کو جہاں کچھ سہارا ملا وہیں کا ہو رہا۔ دہلی برباد ہو کر حیدرآباد اور رام پور آباد ہوئے۔ اکثر شاگردوں سے ایسے نکلے کہ پھر ان کو دہلی کی صورت دیکھنی نصیب نہ ہوئی، جو رہ گئے ہیں، وہ چلنے چلانے کو تیار بیٹھے ہیں، بہت اٹھ گئے، بہت سے اٹھتے جاتے ہیں اور ایک زمانہ وہ آنے والا ہے کہ کوئی یہ بتلانے والا بھی نہ رہے گا کہ مومن مرحوم کا مکان کہاں تھا، جس طرح سوائے میرے اب شاید کسی کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ان کی قبر کہاں ہے۔

ان حالات کو دیکھ دیکھ کر مجھے خیال آیا (اس خیال کی محرک مومن کی تصویر بھی ہوئی) کہ "اردو" کے لئے ان سے ایک ایسا چراغ روشن کر لوں جس کی روشنی میں آنے والی نسلیں زبان اردو کے ان محسنوں کی شکلیں (خواہ وہ دھندلی ہی کیوں نہ ہوں) دیکھ سکیں اور ان کا کلام پڑھتے وقت کم سے کم ان کی صورتوں کا ایک مبہم سا

نقشہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ جو لوگ علمی مذاق رکھتے ہیں وہ
جانتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ کسی کا کلام پڑھتے وقت اگر اس کی شکل و صورت، حرکات و
سکنات، آواز کی کیفیت، نشست و برخاست کے طریقے، طبیعت کا رنگ اور سب سے زیادہ
یہ کہ اس کے لباس اور وضع قطع کا خیال دل میں رہے تو اس کا کلام ایک خاص اثر پیدا
کر دیتا ہے اور پڑھنے کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے ورنہ مصنف کے حالات سے واقف
ہوئے بغیر اس کی کسی کتاب کا پڑھ لینا گراموفون کے ریکارڈ سننے سے زیادہ مؤثر نہیں
ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کل مہذب ممالک میں کسی مصنف کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوتی
جس کے شروع میں اس کے حالات درج نہ کئے جائیں، اور وہ واقعات نہ دکھائے
جائیں جن کی موجودگی میں وہ تصنیف ضبط تحریر میں آئی۔

یہی خیالات تھے جنھوں نے مجھے ان چند اوراق کے لکھنے پر آمادہ کیا۔ اس میں
آپ ایسی بہت سی تصویریں دیکھیں گے جو آن کا لین فن نے اپنے ہاتھ سے خود کھینچی ہیں،
بہت سے ایسے مرقعے پائیں گے جو دوسرے مصوروں کے ہاتھ کے بنے ہوئے ہیں، بعض
ایسے نقش و نگار ملیں گے جو فوٹو یا قلمی تصاویر دیکھ کر الفاظ میں دکھائے گئے ہیں، اکثر و بیشتر
ایسی صورتیں ہوں گی جو خود میں نے بڑے بوڑھوں سے پوچھ کر بنائی ہیں، لیکن ہر صورت
میں شہادت تائیدی کے مقابلے میں شہادت تردیدی کو زیادہ وقعت دی ہے۔ لیکن اگر کسی
واقعے کے متعلق ایک بھی مخالف بات معلوم ہوئی تو اس واقعے کو قطعاً ترک کر دیا۔

اگر اتنے سارے حلیے ایک جگہ ہی جمع ہو جاتے تو یقیناً یہ مضمون فوج کے
چہروں کا رجسٹر بن کر بے لطف ہو جاتا لیکن ادھر آزاد مرحوم کے "نیرنگ خیال" نے
دل میں مشاعرے کا خیال ڈالا، ادھر کریم الدین مغفور کی کتاب "طبقات الشعرائے ہند"
کے طبقہ چہارم نے رجب سنہ ۱۲۶۱ھ کے ایک مشاعرے کا پتا دیا۔ اب کیا تھا دونوں کو ملا کر
ایک مضمون پیدا کر لیا۔ رہی رنگ آمیزی، اس کی تکمیل میں خود کئے دیتا ہوں۔ البتہ
اچھے برے کی ذمہ داری نہیں لیتا۔

بحیثیت مورخ "۱۲۷۱ھ" کے واقعات صحیح اس طرح لکھ سکتا تھا گویا یہ سب میرے چشم دید ہیں اور سہ

ہمچو سبزہ بار ہا روئیدہ ام
ہفت صد ہفتاد قالب دیدہ ام

منظر دیکھتے ہوئے اس زمانے کا بھی "الم نشرح" ہو سکتا تھا مگر میرے دل نے گوارا نہیں کیا کہ کریم الدین مرحوم کی کامیابی کا سہرا اپنے سر پر باندھوں اور ایسے شخص کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دوں جس نے اس مشاعرے میں بہت بڑا حصہ لیا تھا جس کے مکان پر یہ مشاعرہ ہوا تھا اور جو اس مشاعرے کی روح رواں تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ان کی یہ مجلس محدود تھی اور میں نے اس کو اتنی وسعت دی ہے کہ اس زمانے کے تقریباً سب بڑے بڑے شعرا کو اس میں لا بٹھایا ہے۔ اب اس میں مجھے کامیابی ہوئی یا نہیں اس کا اندازہ قارئین کرام فرما سکتے ہیں۔ اگر ہوئی ہے تو زہے نصیب میری محنت ٹھکانے لگی۔ اگر نہیں ہوئی تو کم سے کم یہی سمجھ کر میری داد دی جائے کہ مرزا صاحب نے بات تو اچھی پیدا کی تھی مگر نباہ نہ سکے جو ان سے نہیں ہوا وہ اب ہم کر دکھاتے ہیں۔ "غرض یہ ہے کہ اس طرح کوئی قلم کا دھنی ان "خفتگانِ خاک" کا کوئی ایسا مرقع تیار کر دے جو ہمارے ادب اردو میں سمانے کے قابل ہو۔

لیجئے "اب" "مولوی کریم الدین صاحب" کی جیون بیتا حاضر خدمت کرتا ہوں۔ لیکن یہ ضرور عرض کیے دیتا ہوں کہ جب میں اپنی تمام محنت [illegible] صاحب کی نذر کر رہا ہوں تو جو کچھ برا بھلا آپ کو اس مضمون کے [illegible] مجھے نہ کہیے مولوی صاحب کو کہیے اور خوب دل بھر کر [illegible] خوش اور میرا خدا خوش۔ والسلام

۲۔ تدبیر

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا

نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

میرا نام کریم الدین ہے۔ میں پانی پت کا رہنے والا ہوں۔ قصبہ دہلی سے ۴۰ کوس پر بجانب شمال مغرب واقع ہے اور اپنی لڑائیوں کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہے۔ ہم اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے، مولویوں کا خاندان تھا لیکن زمانے کی گردش نے ایسا پیسا کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہو گئے، جائداد ضبط ہو گئی۔ میرے دادا صاحب قبلہ ایک مسجد میں جا بیٹھے اور اللہ اللہ کرکے گزار دی۔ جب ضبط شدہ جائدادوں کے متعلق دریافت شروع ہوئی تو توکل نے ان کا دامن پکڑ لیا، اپنی جگہ سے نہ ہلے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے روٹیوں کا سہارا کھو بیٹھے۔ میرے والد سراج الدین مرحوم مصداق "عصمت بی بی از بے چادری" متوکل بنے رہے اور مسجد میں ایسے بیٹھے کہ مر کر اٹھے۔ میں ۱۲۳۷ھ میں عین عید الفطر کے دن پیدا ہوا۔ میری تعلیم ان ہی دونوں بزرگوں کے ہاتھوں ہوئی لیکن بے چینی طبیعت اور خانگی جھگڑوں نے آخر پانی پت چھڑایا۔ اس زمانے میں دہلی میں علم کا بڑا چرچا تھا، ہر فن کے کاملوں سے دہلی بھری پڑی تھی، ہر سمت علم کے چشمے جاری تھے۔ ملا کی دوڑ مسجد، میں بھی پانی پت چھوڑ کر دہلی آ گیا۔ کاپی نویسی سے گزارا کرتا، محنت مزدوری کے بعد ذوقِ علم ہر حلقۂ درس میں کھینچے لے جاتا۔ اسی زمانے میں دہلی کالج کی تعلیم جدید ہوئی تھی، طالب علموں کی تلاش تھی، میں بھی ۱۸ سال کی عمر میں وہاں شامل ہو گیا۔ ۱۶ روپیہ وظیفہ بھی مقرر ہوا اور اس طرح میں نے علم کی پیاس بڑی حد تک بجھائی۔ لیکن وہ یہ زمانہ نہیں تھا کہ علم کو علم کے لیے حاصل کیا جاتا۔ اب اس ساکھ گزارنے کی ایک بڑی شوق لگ گئی تھی، اس لیے دوستوں کے ساتھ مل کر ایک

مطبع کھولا، قاضی کے حوض پر مبارک النساء بیگم کی حویلی کرایہ پر لی۔ عربی کی مشہور
مشہور کتابوں کے ترجمے چھاپے، لیکن مطبع جیسا چلنا چاہیے تھا نہ چلا۔ یہ اردو
شاعری کے شباب کا زمانہ تھا، بادشاہ سے لے کر فقیر تک سب اسی رنگ
میں رنگے ہوئے تھے، خیال آیا کہ ایک مشاعرہ قائم کر کے شعراء کے حالات اور
ان کا کلام طبع کروں، ممکن ہے کہ اس طرح مطبع چل جائے۔ مجھے شاعری سے
نہ کبھی لگاؤ تھا اور نہ اب ہے بلکہ شعر کہنا میں برا جانتا ہوں کیوں کہ اہلِ علم کا پیشہ نہیں ہے۔ وہ
لوگ جو معیشت سے فارغ البال ہیں اپنا دل بہلاتے اور حسرت نکالنے کیلئے [illegible]
میں تو عالم ہوں، میرے باپ دادا عالم تھے، بھلا میں تو اس قسم کی فضولیات کی
طرف توجہ بھی نہ کرتا، مگر کیا کروں ضرورت سب خیالات پر حاوی ہو گئی اور مجھے مشاعرہ
پر مجبور کیا۔ لیکن بڑی مصیبت یہ ہے کہ ایک تو اس شہر میں غریب اور مفلس [illegible]
کو منہ نہیں لگاتے، دوسرے یہ کہ میری جان پہچان قلعے کے مولویوں سے ہے وہ بھلا اس [illegible]
میں میرا کیا ساتھ دے سکتے تھے، سوچتے سوچتے نواب زین العابدین خاں عارف
پر نظر پڑی، ان سے دو چار دفعہ ملنا ہوا تھا، بڑے خوش اخلاق آدمی ہیں۔ لال کنوئیں
کے پاس ایک حویلی ہے اس کو مدرسہ بھی کہتے ہیں، وہاں رہتے ہیں۔ کوئی ۳۰ سال کی
عمر ہے، بھوری رنگت، اونچا قد اور نہایت جامہ زیب آدمی ہیں۔ البتہ داڑھی کھل کر
نہیں نکلی ہے۔ ٹھوڑی ہی پر کچھ گنتی کے بال ہیں۔ غالب کے بھانجے ہیں اور
شاگرد بھی۔ کچھ عرصے تک شاہ نصیر سے بھی اصلاح لی ہے۔ بہرحال ان کی محبت
ان کی شرافت اور سب سے زیادہ ان کے رسوخ نے مجھے ان کی خدمت میں حاضر ہونے
اور اس بارے میں ان کی امداد حاصل کرنے پر مجبور کیا۔ ایک روز صبح ہی صبح گھر سے
نکل ان کے مکان پر پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ حکیم احسن اللہ خاں صاحب وزیر اعظم
کے مکان پر تشریف لے گئے ہیں۔ حکیم صاحب کا مکان سرکی والوں میں تھا۔ واپسی
میں دروازے پر دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ نواب زین العابدین خاں اندر ہیں

چوبدار کے ذریعے سے اطلاع کرائی۔ انھوں نے اندر بلالیا۔ بڑا عالی شان مکان
ہے صحن میں اندر پہنچا سامنے بڑا چبوترہ ہے اور چبوترے پر بڑے بڑے دالان در دالان
مکان خوب آراستہ و پیراستہ ہے۔ ہر چیز سے امارت ٹپکتی ہے۔ سامنے گاؤ تکیہ سے
لگے نواب صاحب بیٹھے تھے۔ میں نے تو ان کو پہچانا بھی نہیں۔ سوکھ کر کانٹا ہو گئے
تھے اور چہرے پر جھریاں پڑ گئی تھیں۔ میں نے سلام کر کے کیفیت پوچھی کہنے لگے
"مولوی صاحب! ایسا کیوں کچھ دل بیٹھا جاتا ہے بظاہر کوئی مرض بھی نہیں۔ حکیم صاحب کا
علاج کر رہا ہوں لیکن نتیجہ کچھ بھی نہیں۔ اب ہمارے چل چلاؤ کا زمانہ ہے کچھ دنوں دنیا کی ہوا
کھا رہے ہیں۔ اگر یہ تو کہئے آج آپ کدھر نکل آئے۔" میں نے واقعات کا اظہار کر کے
ضرورت بیان کی۔ تھوڑی دیر تک سوچتے رہے پھر آہ بھر کر کہا "میاں کریم الدین
تم کو بات اچھی سوجھی ہے مگر یہ بھی اس زمانہ میں مشکل ہے۔ تمہیں خبر نہیں دہلی
کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ پانچ دنوں میں فرق ڈال دیئے ہیں۔ دل تو میرا بھی چاہتا ہے کہ
مرنے سے پہلے ایک ایسا تذکرہ دیکھ لوں جس میں یہاں کے سب کاملین فن جمع ہو جائیں
مگر مجھ میں اب اتنی ہمت ہی نہیں ہوتی۔ اچھا تم بھی کوشش کرو میں بھی کرتا ہوں
ممکن ہے کہ کوئی صورت نکل آئے۔ ہاں حکیم صاحب کو آنے دو ایک تجویز
ذہن میں آتی ہے اگر چل گئی تو میری بھی آخری خواہش پوری ہو جائے گی اور تمہارا
بھی کام نکل جائے گا۔" ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ حکیم صاحب نکل آئے۔ گورے
چٹے آدمی ہیں۔ سفید چھریری ہوئی داڑھی، گول چہرہ اس میں کچھ کچھ چیچک کے داغ،
آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ سر سے پاؤں تک سفید لباس پہنے ہوئے تھے۔ فن طب
میں کامل اور تاریخ کے عالم ہیں۔ میں آداب بجا لایا۔ میری طرف مسکرا کر دیکھا اور نواب
صاحب سے کہا: "آپ کی تعریف کیجئے۔" انھوں نے کہا: "میرے قدیم ملنے والوں
میں سے ہیں۔ خود شاعر نہیں مگر سخن فہم ہیں۔ آج کل خیال پیدا ہوا ہے کہ شعرائے دہلی کا
ایک تذکرہ لکھیں اور اس میں ان کے حلیے اور ان کے کلام کے نمونے دکھائیں۔

مجھ سے مشورہ کرنے آئے تھے آپ جانتے ہیں مجھے ان چیزوں سے عشق ہے اب
اپنے آخری وقت چاہتا ہوں کہ اپنے رنگ کا ایک مشاعرہ اور دیکھ لوں اگر آپ
مدد فرمائیں تو یہ مشکل آسان ہو سکتی ہے۔" حکیم صاحب کہنے لگے "میاں عارف!
خدا کے لئے تم ایسی یاسیت کی باتیں نہ کیا کرو ابھی جوان ہو انشاء اللہ خود طبیعت
مرض پر غالب آجائے گی اور تمہیں مرض ہی کیا ہے، وہم ہی وہم ہے۔ ہاں یہ تو
بتاؤ تم مجھ سے کس قسم کی مدد چاہتے ہو۔" نواب صاحب نے کہا "حکیم جی! اور
کچھ نہیں اتنا کردو کہ میاں کریم الدین کو بارگاہ جہاں پناہی تک پہنچا دو۔ میں خود
جاتا مگر ہمت نہیں ہوتی۔ میں ان کو بہت کچھ سمجھا دوں گا۔ اگر حضرت ظل اللہ اپنا
کلام بھیجنے پر راضی ہو گئے تو مشاعرہ کا جم جانا کوئی مشکل کام نہیں ہے اور بدقسمتی سے
انکار ہو گیا تو پھر مشاعرے کا خیال کرنا ہی فضول ہے۔ اب رہا مشاعرے کا انتظام
وہ میں خود کرلوں گا کیونکہ بیچارے ان چیزوں کو کیا سمجھیں۔" حکیم صاحب پہلے تو
کچھ سوچتے رہے پھر کہا "عارف! تمہارے لئے میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں
اس لئے اور بھی کروں گا کہ اس سے تمہاری طبیعت بہل جائے گی اور کچھ دنوں
اس مشغلے میں لگ کر شگفتہ ہو کر تمہارے دل سے مرض کا وہم جاتا رہے گا۔ بادشاہ
سلامت سے تو میں کہتا نہیں [illegible] دوست کو صاحب عالم مرزا فتح الملک[1]
بہادر سے ملا دیتا ہوں [illegible] کی لو لگی ہوئی ہے حضور سے بھی
[illegible] نواب صاحب نے ذرا بھی زور دیا تو مجھے

---

[1] [illegible] مرزا فخر الدین [illegible] مرزا فتح الملک شاہ بہادر [illegible] رمز تھا۔
بہادر شاہ ثانی کے منجھلے بیٹے تھے [illegible] سلطنت کے انتقال
کے بعد [illegible] ولی عہد ہوئے [illegible] ۱۰ جولائی ۱۸۵۲ء [illegible] سال کی عمر
میں انتقال کیا۔ ان کے انتقال کے بعد مرزا جوان بخت کی ولی عہدی کی [illegible] سے ہوئے

یقین ہے کہ صاحب عالم کہہ سن کر ضرور اجازت حاصل کر لیں گے۔ اچھا مولوی
صاحب کل آپ ایک بجے قلعۂ معلی میں آجائیے۔ میں چوبدار سے کہے جاتا ہوں،
یہ اندر پہنچا دے گا۔ آگے آپ جانیں اور آپ کی قسمت۔" یہ کہہ کر حکیم صاحب نے
خدا بخش کو آواز دی۔ وہ آیا تو اس سے کہا کہ "کل یہ صاحب حویلی[1] میں ایک بجے
آئیں گے۔ ان کو میری بیٹھک میں پہنچا دینا۔" یہ کہہ کر وہ نواب صاحب کی طرف
متوجہ ہو گئے اور میں آداب کر کے واپس چلا آیا۔

دوسرے روز ایک بجے کے قریب میں مولویانہ ٹھاٹھ سے جبہ پہن شملہ باندھ
قلعۂ معلی پہنچا۔ لاہوری دروازے کے باہر خدا بخش کھڑے ہوئے تھے، وہ مجھ کو
حکیم صاحب کی بیٹھک میں لے گئے۔ یہ بیٹھک جس کو پہلے زمانے میں "دفتر مست"
کہا جاتا تھا دیوان عام سے ملی ہوئی تھی۔ حکیم صاحب بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے، مجھے
دیکھ کر بولے: "لیجئے مولوی صاحب! میں نے آپ کا کام کر دیا ہے۔ صاحب عالم
مرزا فتح الملک بہادر سے صبح ہی کو ملنا ہو گیا۔ وہ اس تجویز سے بڑے خوش ہوئے
فرمانے لگے جہاں پناہ سے میں اجازت لے لیتا ہوں، مگر مشاعرے کا انتظام ایسا
ہونا چاہیے کہ ہم لوگ بھی آ سکیں۔ خیر بیٹھئے شاید ابھی آپ کی یاد ہو۔" میں ایک طرف
بیٹھ گیا۔ بیٹھا ہی تھا کہ چوبدار نے آ کر کہا "وہ کریم الدین کون صاحب ہیں؟ ان کو
حضور والا یاد فرماتے ہیں۔" یہ سننا تھا کہ میرے پسینے چھوٹ گئے۔ میں سمجھا تھا کہ
حکیم صاحب ہی کے پاس جا کر معاملہ طے ہو جائے گا۔ یہ کیا خبر تھی کہ بارگاہ جہاں پناہی
میں باریابی ہو گی اور بادشاہ بھی ایسے وقت کہ میرا سانس بھی پیٹ میں پوری طرح نہیں سمایا ہو گا۔
ناچار جان کو مرگ مفاجات سمجھا اور چوبدار کے پیچھے پیچھے روانہ ہوا۔ تاہم راستے
آیۃ الکرسی پڑھتا جاتا تھا۔ آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا کہ کہاں ہوں۔ خدا خدا کر کے جہاں پناہی دربار

---

[1] قلعۂ دہلی کو لال حویلی یا سرخ حویلی بھی کہا جاتا ہے۔ حافظ عبدالرحمن خان احسان کا شعر ہے
مری تنخواہ فوتی ان لٹیروں نے حویلی کی — بادشاہ غازی کی دہائی ہے دہائی ہے

قلعہ دیکھنے کا مدت سے شوق تھا اب جو موقع ملا تو کن انکھیوں سے بھی دیکھنے کی
ہمت نہ ہوئی۔ چلتے چلتے آتا رہا۔ آ گئی۔ آخر خدا خدا کر کے چوبدار نے دیوان خاص کی
سیڑھیوں کے پاس سے جا کر کھڑا کر دیا اور آپ اندر اطلاع دینے چلا گیا۔ حضرت جہاں پناہ
اس وقت حمام میں رونق افروز تھے۔ جن صاحبوں نے دہلی کا قلعہ نہیں دیکھا ہے وہ شاید یہ سمجھیں
کہ گرمیوں میں حمام میں بیٹھنے کے کیا معنی۔ اصل یہ ہے کہ یہ حمام کیا ہے ایک عالی شان عمارت
ہے۔ اس کے دو درجے ہیں ایک گرم اور دوسرا سرد۔ عمارت کا جو حصہ موتی مسجد کی
جانب ہے وہ گرم ہے اور جو جمنا کے رخ پر ہے وہ سرد ہے۔ ریتی کے رخ خس کے پردے
ڈال کر خس خانہ بنا لیا جاتا ہے۔ اندر نہر بہشت بہتی ہے۔ بیچ میں کئی بڑے بڑے حوض ہیں
ان میں فوارے چلتے ہیں۔ حمام کیا ایک بہشت کا ٹکڑا ہے۔ چوبدار جو گیا تو آنے کا
نام نہیں لیتا۔ دھوپ میں کھڑے کھڑے فشار ہو گیا۔ پسینے میں تر بتر، گردن نیچی کیے
کھڑا ہوں اور ناک سے پسینے کی بوندیں ٹپک رہی ہیں۔ ارادہ ہوا کہ واپس
چلا جاؤں مگر اول تو طلبی کے بعد بھاگ جانا نازیبا، دوسرے راستہ کس کو معلوم۔
خدا خدا کر کے یہ مشکل آسان ہوئی اور چوبدار نے آ کر کہا کہ "چلیے"۔ اس ایک لفظ نے
خود بخود پاؤں میں لغزش اور دل میں کپکپی پیدا کر دی۔ خیر کسی نہ کسی طرح اٹھتے بیٹھتے
پاؤں ڈالتا حمام مبارک میں داخل ہو گیا۔ چوبدار نے آواز دی "ادب سے نگاہ روبرو،
حضرت جہاں پناہ سلامت آداب بجا لاؤ"۔ میں نواب زین العابدین خاں صاحب
سے سبق پورا اور اچھی طرح پڑھ کر آیا تھا۔ دہرا ہو ہو کر سات تسلیمات بجا لایا اور نذر گزرانی۔
نذر دیتے وقت ذرا آنکھ اونچی ہوئی تو وہاں کا رنگ دیکھا۔ حضرت پیر و مرشد ایک
چاندی کی پلنگڑی پر لیٹے تھے، پائنتی مرزا فخرو بیٹھے پاؤں دبا رہے تھے۔ دلی میں
وہ کون ہے جس نے حضرت ظل اللہ کو نہیں دیکھا۔ میانہ قد، بہت نحیف جسم، کسی قدر
لمبا چہرہ، بڑی بڑی روشن آنکھیں، آنکھوں کے نیچے کی ہڈیاں بہت ابھری
ہوئی، لمبی گردن، بیچ کا ذرا اٹھا، پتلی ستواں ناک، بڑا دہانہ، گہری سانولی

رنگت سرخ سفید ہوا، چھدری داڑھی، گالوں پر بہت کم ٹھوڑی پر ذرا زیادہ، لمبیں کترى ہوئی۔ ۷۰ برس سے اونچی عمر تھی۔ بال سفید بھق ہو گئے تھے، لیکن باوجود اس پیرانہ سالی اور نقاہت کے آواز میں وہی کرارا پن تھا۔ سبز کمخواب کا ایک بر کا پاجامہ اور سفید ڈھاکے کی ململ کا کرتہ زیب بدن تھا۔ سامنے ایک چوکی پر جامہ دار کی خفتان اور کار چوبی چوگوشیہ ٹوپی رکھی ہوئی تھی۔ اب رہے مرزا فخرو تو وہ ہیں بہں باپ کی تصویر تھے۔ ۳۲، ۳۳ برس کی عمر تھی۔ فرق تھا تو بس یہی کہ وہ بڈھے تھے یہ جوان۔ ان کا رنگ بڑھاپے کی وجہ سے ذرا کلونس لے آیا تھا۔ ان کا کھلا ہوا رنگ تھا۔ ان کی داڑھی سفید تھی، ان کی سیاہ۔ ورنہ یہی معلوم ہوتا تھا کہ ایک بادشاہ لیٹے ہیں اور ایک بیٹھے ہیں۔ دونوں نے مجھ پر ایک گہری نظر ڈالی اور بادشاہ سلامت نے فرمایا: "اماں[1] تمہارا ہی نام کریم الدین ہے؟ تم کہیں باہر کے معلوم ہوتے ہو؟" میں نے کہا کہ "خانہ زاد پانی پت کا رہنے والا ہے بچپن ہی سے حضرت ظل اللہ کے سایۂ عاطفت میں آرہا ہے۔" فرمایا: "اماں! ابھی تمہارا ہی تذکرہ کر رہے تھے۔ میرا فخرو کہ رہے تھے میرا خود جی چاہتا ہے کہ پہلے کی طرح

---

[1] شاہان دہلی ہمیشہ مرد و عورت دونوں کو "اماں" سے خطاب کیا کرتے تھے چنانچہ اس طرز کلام کی جھلک اب حیدر آباد میں پائی جاتی ہے۔ مجھے بڑا تعجب ہوا کہ ایک مورخ نے اس طریقہ تخاطب کی بنا پر قلعہ معلی کی تہذیب و اخلاق پر حملہ کیا اور لکھا ہے کہ "بادشاہ کے اخلاق کی پستی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ اپنی بیوی کو بھی "اماں" کہتا تھا۔" معلوم ہوتا ہے کہ جناب انگریزی نہیں جانتے تھے ورنہ ان کو یہ پڑھ کر تعجب ہوتا کہ جس قوم کو وہ تہذیب کا پتلا اور اخلاق کا نمونہ ظاہر کرتے ہیں ان کے ہاں بھی خاوند اپنی بیوی کو "اماں" ہی کہتا ہے اور بیوی خاوند کو بھی "ابا" کبھی "دادا" پکارتی ہے۔ میرے خیال میں یہ "اجی میاں" کا اختصار ہے چنانچہ اب بھی بے تکلف بول چال میں "میاں" کو "ماں" ہی کہہ جاتے ہیں۔)

دیوان عام میں مشاعرہ کروں، مگر کیا کروں زمانے کی ہوا ایسی بگڑ گئی ہے کہ مناسب
معلوم نہیں ہوتا۔ یہ صحیح ہے کہ "بود ہم پیشہ با ہم پیشہ دشمن"، لیکن خدا محفوظ رکھے
ایسی دشمنی بھی کس کام کی کہ دو گھڑی مل جل کر نہ بیٹھنے دے۔ دیوان عام میں
مشاعرہ ہوتا تھا وہ کچھ دنوں ٹھیک چلا پھر میں نے دیکھا کہ بے لطفی بڑھ رہی ہے
اس لئے بند کر دیا۔ منشی فیض اللہ یار نے اجمیری دروازے کے باہر
غازی الدین خاں کے مدرسے میں مشاعرہ شروع کیا تو وہ تیلیوں کی طرح بکھر گیا
وہ تو کہو غنیمت ہوا کہ ردیف میں "تیلیاں" ہی تھیں، کہیں خدا نخواستہ اگر ردیف
"لاٹھیاں" ہوتی تو خدا معلوم کتنوں کے سر پھوٹ جاتے۔ تم مشاعرہ تو
کر رہے ہو مگر ان ہاتھیوں کی ٹکر کیسے سنبھالو گے۔ استاد ذوق تو بیچارے
بے زبان آدمی ہیں مگر خدا بچائے حافظ ویران سے وہ ضرور لڑیں گے اور
تم جانتے ہو "اندھے کی داد نہ فریاد اندھا مارے بیٹھے گا" کسی نے اگر مشاعرے میں
استاد پر ذرا بھی چوٹ کر دی تو ان نابینا صاحب کا سنبھالنا مشکل ہو جائے گا
میاں تم سے یہ کام سنبھلتا نظر نہیں آتا۔" میں نے عرض کی کہ "قبلۂ عالم!
میری کیا ہمت ہے جو اتنے بڑے کام میں ہاتھ ڈالوں۔ مشاعرے کا
سارا انتظام نواب زین العابدین عارف نے اپنے ذمہ لیا ہے۔" فرمایا
"تو پھر مجھے اطمینان ہے۔ یہ لڑکا بڑا ہوشیار اور ذہین ہے۔ مرزا نوشہ
اور مومن خاں کو وہ سنبھال لے گا۔ رہے استاد ذوق ان سے میں کہہ دوں گا
خدا نے چاہا تو اس طرح مشاعرہ چل جائے گا مگر میں یہ کہے دیتا ہوں کہ مشاعرے
سے پہلے ان لوگوں سے مل لینا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ وقت پر انکار کر بیٹھیں۔ میں اور
مرزا شکوہ تو آ نہیں سکتے ہیں۔ ہاں مرزا فخرو کو اپنی جگہ بھیج دوں گا اور
انشاء اللہ اپنی غزل بھی بھیجوں گا۔ ہاں یہ تو بتاؤ کہ تم نے طرح کیا رکھی ہے؟ طرح ہی تو
بڑے جھگڑے کی چیز ہے۔ یہ ذرا سوچ سمجھ کر دینا۔" یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں

کہ باز دسے آواز آئی "سنا ہے یہ اتنا بچہ کیا بے طرح سلگ گئی ہے"۔ یہ سنتے ہی
بادشاہ سلامت نے فرمایا "لو بھائی! یہ خود بخود فال گوش مل گئی۔ تم اس
مشاعرے میں کوئی طرح ہی نہ دو۔ جس شخص کا جس بحر، جس ردیف، قافیہ میں غزل
پڑھنے کو دل چاہے پڑھے۔ "نہ لینا ایک نہ دینا دو" میں نے عرض کی "تاریخ؟"
فرمایا "۱۴ رجب مقرر کرو، دن بھی اچھا ہے، چاندنی رات بھی ہوگی، آج پانچ تاریخ
ہے، نو دن باقی ہیں، اتنے دنوں میں بہت کچھ انتظام ہو سکتا ہے؛ ۲۰ جولائی
پڑے گی، موسم ٹھنڈا ہو جائے گا۔ اچھا اب خدا حافظ۔" میں نے عمر و دولت و اقبال
کی دعا دی اور خوش خوش الٹے قدموں واپس ہوا۔ مرزا فخرو بیچ میں کچھ نہیں بولے
مگر میں سمجھتا تھا کہ یہ سب کیا دھرا انھیں کا ہے، ورنہ کہاں میں اور کہاں یہ خلوت
شاہی۔ سچ ہے بگڑی بن جاتی ہے جب فضل خدا ہوتا ہے۔ یہاں میں اتنا ضرور
کہوں گا کہ میرے لئے حضوری اتنا مشکل کام نہ تھی جتنا یہ الٹے پاؤں واپس ہونا۔
زمین پاؤں کو نہ لگتی تھی، اس لئے دو چار قدم ہی چلا ہوں گا کہ دیوار سے ٹکر کھائی
اس ٹکر سے نہیں سنبھلا تھا کہ نہر میں پاؤں جا پڑا۔ خیر بہ ہزار وقت باہر نکل ہی آیا، ادھر
میں نکلا ادھر میرا رسالہ ہوا۔ اس کو انعام دے دلا کر آیا، حکیم صاحب کے پاس آیا
وہ میرے انتظار میں بیٹھے تھے، ان سے تمام واقعہ بیان کیا۔ فرمانے لگے "مولوی صاحب
بات یہ ہے کہ مرزا فخرو بہت دنوں سے مشاعرے کے لئے بے چین ہو رہے تھے
ان ہی کی یہ کارستانی ہے ورنہ بھلا یہ معاملہ اس طرح تھوڑی طے ہوتا؟ مگر چلیے
تمہارا کام بن گیا۔ اب میاں عارف سے بھی جا کر کہہ دو، وہ میرے ہی پاس [illegible]
کر رہے ہوں گے۔" [illegible] صاحب کے مکان پہنچا تو دیکھا کہ واقعی نواب صاحب میرے
انتظار میں بیٹھے ہیں۔ ان سے سارا [illegible] بیان کیا، کہنے لگے "[illegible] مشکل تو آسان
ہوئی۔ اب [illegible] کل کرکے استاد ذوق، مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں کے
مکان کا گشت لگا ڈالو۔ مگر دیکھنا ذرا پھونک پھونک کر قدم رکھنا، تینوں بھڑ[illegible]

دماغ دار آدمی ہیں، اگر زرا بھی تم سے بات چیت میں لغزش ہوئی تو یاد رکھو کہ بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ جب دیکھو کہ ان میں سے کوئی ہاتھوں سے نکلا ہی جاتا ہے تو میرا نام لے دینا۔ اُمید ہے کہ میرا نام سُن کر شاید راضی ہو جائیں دوسری بات یہ ہے کہ مبارک النسا بیگم کی حویلی جس میں تمہارا مطبع ہے دو روز میں خالی کر کے بالکل میرے حوالے کر دو۔ مجھے وہاں نشست کا انتظام کرنا ہوگا۔" میں نے کہا "اور میں کہاں جاؤں؟" فرمانے لگے "میرے مکان میں آٹھ نو روز کے لیے آجاؤ۔ تم کو تکلیف تو ہوگی مگر کیا کیا جائے۔ جب قلعے کے لوگوں کو بلا رہے ہیں تو ان ہی کے رتبے کے موافق مکان کو بھی درست کرنا ہوگا۔ دیکھئے خرچ کیا پڑتا ہے۔" میں نے کہا "مشاعرے میں خرچ ہی ایسا کونسا ہوتا ہے، زیادہ سے زیادہ سو سوا سو روپے اٹھ جائیں گے۔" یہ سُن کر نواب صاحب مسکرائے اور کہا "میاں کریم الدین! تم کیا جانو کہ ایسے مشاعروں میں کیا خرچ ہوتا ہے۔ ہزار دو ہزار میں بھی اگر یہ کام پورا ہو گیا تو سمجھو کہ سستے چھوٹے۔" یہ سن کر تو میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ میں نے کہا "نواب صاحب! اگر یہ صورت ہے تو میرا ایسے مشاعرہ کو دور ہی سے سلام ہے۔ مطبع تو مطبع اگر اپنے آپ کو بھی بیچ ڈالوں تو اتنی رقم نہ اٹھے۔" فرمانے لگے "بھئی تم اس خرچ کے جھگڑے میں نہ پڑو۔ خدا یہ بھی مشکل آسان کر دیگا۔ جب میں نے اس کام میں ہاتھ ڈالا ہے تو میں جانوں اور میرا کام جانے۔ تم بیٹھے تماشا دیکھو۔ مگر ہاں مکان کل تک خالی کر دینا۔ نو ہی دن تو رہ گئے ہیں، رات کم اور سوانگ بہت ہے۔ اب جاؤ خدا حافظ۔ تم تھک بھی گئے، زرا آرام لے لو اور کل صبح ہی سے اِدھر مکان خالی کرنے کی فکر کرو اور اُدھر ان تینوں استادوں کے مکان کا چکر لگاؤ۔ مکان خالی ہو جائے تو فوراً مجھے اطلاع دینا اور خود میرے ہاں چلے آنا۔ اس میں شرم کی کونسی بات ہے، آخر میری ہی وجہ سے تم اپنا مکان چھوڑ رہے ہو۔" وہاں سے نکل کر میں اپنے گھر آیا۔ مطبع کو بند کرتے کرتے اور سامان کو سمیٹتے سمیٹتے شام ہو گئی۔ صبح

اُٹھ کر اپنے پہننے اوڑھنے کا سامان تو نواب زین العابدین خاں کے مکان پر
روانہ کیا اور خود کابلی دروازے کی طرف چلا کہ پہلے استاد ذوق ہی سے
بسم اللہ کروں۔

کابلی دروازے کے پاس ہی ان کا مکان ہے۔ مکان بہت چھوٹا ہے چھوٹی سی
ڈیوڑھی ہے اس میں ایک طرف جائے ضرورت۔ اندر صحن اتنا چھوٹا ہے کہ دو پلنگ
بچھنے کے بعد راستہ چلنے کے لیے مشکل سے جگہ رہتی ہے۔ سامنے چھوٹا سا دالان ہے
اور اس کے اوپر ایک کمرہ ہے۔ صحن میں سے زنانے مکان میں راستہ جاتا ہے۔ جب میں
پہنچا تو استاد صحن میں بان کی کھری چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ دوسری
چارپائی پر ان کے چہیتے شاگرد حافظ غلام رسول ویران بیٹھے تھے۔ یہ
اندھے ہیں اور ان ہی سے ہوشیار رہنے کے لئے حضرت جہاں پناہ نے ارشاد
فرمایا تھا۔ استاد ذوق قد و قامت میں متوسط اندام ہیں۔ رنگ اچھا سانولا ہے
چہرے پر چیچک کے بہت داغ ہیں۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن اور نگاہیں تیز ہیں۔
چہرے کا نقشہ کھڑا کھڑا ہے۔ اس وقت سفید تنگ پاجامہ، سفید کرتہ اور سفید ہی
انگرکھا پہنے ہوئے تھے۔ سر پہ گول چندوے کی ململ کی ٹوپی تھی۔ میرے پاؤں کی آہٹ
سنتے ہی حافظ ویران نے چونک کر کہا "کون ہے؟" میں نے کہا "کریم الدین
استاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں" استاد نے اپنا نام سن کر کہا۔
"آئیے آئیے اندر تشریف لائیے" میں نے آداب عرض کیا۔ انھوں نے فرمایا "بیٹھو،
بھئی بیٹھو" میں حافظ ویران کے پاس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ کہا "فرمائیے
کیسے تشریف لانا ہوا" میں نے عرض کی کہ میرا ارادہ قاضی کے حوض پر ایک
مشاعرہ شروع کرنے کا ہے ۱۴ رجب تاریخ مقرر ہوئی ہے۔ اگر حضور بھی ازراہِ
بندہ نوازی قدم رنجہ فرمائیں تو بعید از کرم نہ ہوگا" یہ اتنا کہنا تھا کہ حافظ
ویران تو چراغ پا ہوگئے کہنے لگے "جائیے جائیے کہاں کا مشاعرہ نکالا ہے"

استاد کو فرصت نہیں ہے۔ ان مرزا صاحب[1] کے پاس کیوں نہیں جاتے جو خواہ مخواہ ان کو آکر دق کرتے ہو۔ استاد نے کہا "بھی حافظ ویران! تمہاری زبان نہیں رکتی، بیٹھے بٹھلائے تم دنیا بھر سے لڑائی مول لیتے ہو" حافظ ویران کہنے لگے "استاد! جب وہ آپ کو برا بھلا کہیں تو ہم کیوں چپ بیٹھے رہنے لگے۔ وہ ایک کہیں گے تو ہم سو سنائیں گے اور تو اور میاں آشفتہ کو دق کرنے لگے ہیں کل ہی کی بات ہے آپ کو نا ڈرا کہہ رہے تھے مگر میں نے بھی ایسی خبر لی کہ تمام عمر یاد کریں گے ان کی ساتٹ پشت کو تو ہم ڈالا" استاد ہنس کر فرمانے لگے "وہ تا کبھی نا" تم میری وجہ سے کیوں بلا میں پڑتے ہو۔ مجھے جس کا جو جی چاہے سو کہے میں نے تو ان سب کا جواب ایک رباعی میں دے دیا ہے

تو بھلا ہے تو برا ہو نہیں سکتا اے ذوق ٭ ہے برا وہ ہی کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے
اور جو تو خود ہی برا ہے تو وہ سچ کہتا ہے ٭ کیوں برا کہنے سے اس کے تو برا مانتا ہے

میں نے عرض کی کہ میں کل بارگاہ شاہی میں حاضر ہوا تھا حضرت ظل اللہ نے ارشاد فرمایا تھا کہ "اس مشاعرے میں ہم مرزا شیخ الملک بہادر کو اپنی طرف سے بھیجیں گے اور اپنی غزل بھی بھیج کر مشاعرے کی عزت بڑھائیں گے اور یہ بھی ارشاد ہوا تھا کہ استاد ذوق سے بھی کہہ دینا کہ وہ بھی مشاعرے میں ضرور آئیں گے" یہ سن کر حافظ ویران تو ٹھنڈے پڑ گئے۔ استاد نے فرمایا "ہاں بھئی مجھے یاد آ گیا کل شام کو حضرت پیر و مرشد نے مجھ سے بھی فرمایا تھا اور یہ بھی ارشاد فرمایا تھا کہ تم بھی

---

[1] ان دنوں دہلی میں لوگوں نے یہ اڑا رکھا تھا کہ مرزا نوشہ (غالب) مرزا عبداللہ بیگ کے بیٹے نہیں ہیں بلکہ انھوں نے ان کو پال لیا ہے اور یہ در اصل کسی کشمیری کی اولاد ہیں۔ حافظ ویران نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے، خدا محفوظ رکھے دہلی والوں سے جو باہر سے آیا اس کے نسب پر انھوں نے کیڑے ڈالے۔ [2] استاد ذوق کو شہر بھر نانی کہتا ہے یہ دوسری بات ہے کہ آزاد مرحوم نے ان کے ہاتھوں میں استرے کے بجائے تلوار دے کر سپاہی زادہ بنا دیا ہے۔

ضرور جائیو۔ میاں میں ان شاء اللہ تعالیٰ ضرور آؤں گا۔ مگر یہ تو بتاؤ طرح کیا رکھی ہے؟"
میں نے واقعہ عرض کیا اور کہا کہ حضرت ظلِ سبحانی نے "طرح" کا جھگڑا[1] ہی نکال
دیا۔ جو شخص جس بحر اور جس ردیف، قافیہ میں چاہے آکر غزل پڑھے۔ استاد تو "بہت
خوب، بہت خوب" کہتے رہے مگر حافظ ویران کی تیوری کے بل نہیں گئے۔ برابر
بڑبڑاتے ہی رہے کہ "لعنت۔ خیر کرے دیکھئے اس مشاعرہ کا کیا حشر ہوتا ہے۔ حضرت
پیر و مرشد بھی بیٹھے بیٹھے شگوفے چھوڑا کرتے ہیں۔" وہ اپنی کہے گئے میں
تو اٹھ سلام کر چلا آیا۔

دوسرا حملہ اسد اللہ خاں غالب پر تھا۔ چاندنی چوک سے ہوتا ہوا
بلیماران میں آیا۔ حکیم محمود خاں صاحب کے مکان کے سامنے قاسم جان
کی گلی کٹتی ہے۔ بائیں طرف پہلا ہی مکان ان کا تھا۔ یہ مکان مسجد کے پیچھے ہے
اس کے دو دروازے ہیں۔ ایک مردانہ دوسرا زنانہ۔ محلسرا کا ایک راستہ
مردانہ مکان میں سے بھی ہے۔ باہر کے دروازے کی دہلیز ذرا دھنسی ہوئی سی
ہے۔ دروازے کے اوپر ایک کمرہ ہے اور کمرے کے دونوں پہلوؤں میں دو
کوٹھریاں۔ گرمی میں مرزا صاحب دوپہر کے وقت اسی ایک کوٹھری میں رہا
کرتے تھے۔ دروازے سے گزر کر مختصر سا صحن ہے اور سامنے ہی دالان
در دالان۔ جب میں پہنچا تو اندر کے دالان میں گاؤ تکیے سے بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔
مرزا نوشہ کی عمر کوئی ۶۰ سال کی ہوگی۔ حسین اور خوش رو آدمی ہیں
قد اونچا اور ہاڑ بہت چوڑا چکلا، موٹا موٹا نقشہ اور سرخ و سفید رنگ ہے
لیکن اس میں کچھ کچھ زردی جھلکتی ہے۔ ایسے رنگ کو محاورے میں چمپئی کہا جاتا

---

[1] معلوم نہیں کس زبان کا لفظ ہے مگر دہلی میں عام طور پر "شگوفے" کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

ہے۔ آگے کے دانت ٹوٹ گئے ہیں، داڑھی بھری ہوئی ہے مگر گھنی نہیں ہے
سر منڈا ہوا اس پر لمبی سیاہ پوستین کی ٹوپی ہے جو کلاہ پاپاخ سے ملتی جلتی ہے
ایک بر کا سفید پاجامہ، سفید ململ کا انگرکھا، اس پر ہلکے زرد زمین کی جامہ وار کا
چغہ[1] میری آہٹ پاکر لکھتے لکھتے آنکھ اونچی کی۔ میں نے آداب کیا، سلام کا
جواب دیا اور آنکھوں سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ ابھی بیٹھا
ہی تھا کہ نواب ضیاء الدین احمد خاں آگئے۔ یہ امین الدین خاں صاحب
نواب لوہارو کے بھائی ہیں۔ ریختے میں رخشاںؔ اور فارسی میں نیرؔ تخلص کرتے
ہیں۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہے۔ انشاء پردازی، جغرافیہ، تاریخ، علم انساب، اسمائے
رجال، تحقیق لغات اور واقفیت عامہ میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ مرزا نوشہ کے
خلیفہ ہیں۔ چھوٹا قد، بہت گورا رنگ، نازک نازک نقشہ، غلافی آنکھیں، چھوٹی داڑھی
چھریرا بدن۔ غرض نہایت خوبصورت آدمی ہیں۔ ایک بر کا سفید پاجامہ اور سفید ہی
انگرکھا زیب بدن تھا، قالب چڑھی ہوئی چوگوشیہ ٹوپی سر پر تھی، ایک بڑا رومال
سموسہ بنا کر کندھے پر ڈالے ہوئے تھے۔ میں نے اٹھ کر سلام کیا۔ انھوں نے بڑھ کر
مصافحہ کیا اور خاموش ایک طرف دوزانو نہایت ادب سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر
میں مرزا غالبؔ بھی لکھنے سے فارغ ہوئے۔ پہلے نواب صاحب کی طرف بڑھے
اور کہنے لگے "میاں نیرؔ تم کس وقت آ بیٹھے تھے۔ اس مرزا تفتہؔ نے میرا
ناک میں دم کر دیا ہے۔ ظالم کی طبیعت کی روانی کسی طرح کم نہیں ہوتی ہر خط میں آٹھ آٹھ
دس دس غزلیں اصلاح کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ اصلاح دیتے دیتے تھک جاتا ہوں"
میری طرف دیکھ کر کہا "آپ شاید مولوی کریم الدین صاحب ہیں" میں نے کہا
"جی ہاں" فرمانے لگے حضرت! آپ کے تشریف لانے کی مجھے پہلے ہی سے
اطلاع مل گئی تھی۔ کل ہی میاں عارفؔ آکر مجھ سے مشاعرے میں چلنے کا وعدہ

[1] قلعہ دہلی کے عجائب خانے میں مرزا غالب کی ایک تصویر ہے، اس سے یہ لباس لیا گیا ہے۔

لے گئے ہیں۔ کہو میاں تیر! تم بھی چلوگے؟" نواب صاحب نے کہا "جہاں آپ وہاں میں۔ آپ تشریف لے جائیں گے تو انشاء اللہ میں بھی ضرور ہمراہ ہونگا۔" مرزا صاحب نے پوچھا "کیوں اب تک علائی نہیں آئے مجھ کو ان کا کل سے انتظار ہے۔ اے لو وہ آہی گئے۔ بھئی بڑی عمر ہے ابھی میں تم کو پوچھ رہا تھا"

نواب علاء الدین خاں علائی، نواب لوہارو کے ولی عہد ہیں۔ کوئی ۲۳، ۲۴ سال کی عمر ہے۔ متوسط قد، گندمی رنگ، موٹا موٹا نقشہ، گول چہرہ، شربتی آنکھیں اور گھنی چھٹی ہوئی داڑھی ہے۔ لباس میں غلطے کا تنگ مہری کا پاجامہ، سفید جامدانی کا انگرکھا، اس پر سینہ کھلی ہوئی سیاہ مخمل کی نیمہ آستین اور سر پر سیاہ مخمل کی چوگوشیہ ٹوپی تھی۔ وہ بھی آداب کر کے ایک طرف بیٹھ گئے اور کہا "واقعی آج دیر ہو گئی۔ مجھے خود خیال تھا کہ آپ انتظار کر رہے ہوں گے۔" میری طرف دیکھ کر کہا "آپ کی تعریف؟" مرزا تفتہ نے تمام قصہ بیان کیا اور کہا "علائی! تم کو بھی چلنا ہوگا۔ کبھی تم شاید لوہارو نہیں جا رہے ہو؟" انھوں نے کہا "بہت خوب! آپ تشریف لے جائیں گے تو میں بھی حاضر ہوں گا۔" جب یہ مرحلہ بھی طے ہو گیا تو میں نے اجازت چاہی۔ وہاں سے رخصت ہو کر زین العابدین خاں کے مکان میں آیا۔ انھوں نے مردانے کا ایک حصہ میرے لئے خالی کر دیا تھا جو اسباب تنبع ہیں۔ بھیجا تھا اس کو سجا سجایا پایا۔ کپڑے اتارے اندر سے کھانا آیا کھانا کھا کر تھوڑی دیر سو رہا۔ چار بجے کے قریب اٹھ کر حکیم مومن خاں کے ہاں جانے کی تیاری کی۔

حکیم صاحب کا مکان چیلوں کے کوچہ میں ہے۔ راستہ میں مولوی امام بخش صاحب صہبائی مل گئے۔ کالج میں میرے استاد رہے ہیں۔ کھلا ہوا گندم گوں رنگ ہے منہ پر کہیں کہیں چیچک کے داغ ہیں۔ سر پر پٹے ہیں۔ بڑے دبلے پتلے آدمی ہیں۔ کوئی ۵۰ سال کی عمر ہوگی۔ ایک برکا سفید پاجامہ پہنتے ہیں۔ یہ بھی چیلوں کے

کوچے ہی میں رہتے ہیں۔ مجھ سے پوچھنے لگے "کہاں جاتے ہو؟" میں نے کہا "حکیم مومن خاں کے پاس۔" پوچھا "کیا کام ہے؟" میں نے حال بیان کیا۔ کہنے لگے "چلو میں بھی وہیں جا رہا ہوں۔" حکیم آغا خاں کے چھتے کے سامنے خاں صاحب کا مکان تھا، بڑا دروازہ ہے، اندر بہت وسیع صحن اور اس کے چاروں طرف عمارت ہے۔ دو طرف دو صحنچیاں ہیں اور سامنے بڑے بڑے دالان در دالان۔ پہلے دالان کے اوپر کمرہ ہے۔ سامنے کے دالان کی چھت کو کمرے کا صحن کر دیا ہے۔ لیکن منڈیر بہت چھوٹی رکھی ہے۔ دالانوں میں چاندنی کا فرش ہے۔ اندر کے دالانوں میں بیچوں بیچ قالین بچھا ہوا، قالین پر گاؤ تکیے سے لگے حکیم صاحب بیٹھے ہیں۔ سامنے حکیم سکھانند المتخلص بہ رقم اور مرزا رحیم الدین حیا مؤدب دو زانو بیٹھے ہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی دربار ہو رہا ہے کہ کسی کو آنکھ اٹھا کر دیکھنے اور بلا ضرورت بولنے کا یارا نہیں۔ حکیم مومن خاں کی عمر تقریباً ۴۱ سال کی تھی، کشیدہ قامت، سرخ سفید رنگ تھا، جس میں سبزی جھلکتی تھی، بڑی بڑی روشن آنکھیں، لمبی لمبی پلکیں، کھنچی ہوئی بھویں، لمبی ستواں ناک، پتلے پتلے ہونٹ، ان پر پان کا لاکھا جما ہوا، مسی آلودہ دانت، ہلکی ہلکی مونچھیں، خشخشی داڑھی، بھرے بھرے ڈنڈ، پتلی کمر، چوڑا سینہ اور لمبی انگلیاں، سر پر گھونگر والے لمبے لمبے بال، کاکلوں کی شکل میں کچھ تو پشت پر اور کچھ کندھوں پر پڑے ہوئے، کان کے قریب تھوڑے سے بالوں کو موڑ کر زلفیں بنا لیا تھا۔ بقیہ

ے میں نے خود یہ مکان بیس بائیس برس ہوئے دیکھا تھا۔ ٹوٹ کر کھنڈر ہو گیا تھا، تین طرف کی عمارت ڈھے گئی تھی۔ سامنے کا حصہ قائم تھا۔ معلوم نہیں کہ اوپر کی منڈیر کیوں اتنی نیچی رکھی گئی تھی اسی منڈیر سے ٹھوکر کھا کر حکیم مومن خاں نیچے گرے ہاتھ اور بازو ٹوٹ گیا اور اسی کی وجہ سے ان کا انتقال ہوا۔ خود ہی مرنے کی تاریخ کہی تھی کہ ع "دست بازو بشکست"

شربتی ململ کا نیچی چولی کا انگرکھا تھا لیکن اس کے نیچے کرتہ نہ تھا اور جسم کا کچھ حصّہ انگرکھے کے پردے میں سے دکھائی دیتا تھا۔ گلے میں سیاہ رنگ کا فیتہ، اس میں چھوٹا سا سنہری تعویذ کاکریزی رنگ کے دوپٹے کو بل دے کر کمر میں لپیٹ لیا تھا اور اس کے دونوں کونے سامنے پڑے ہوئے تھے، ہاتھ میں پتلا سا خار پشت، پاؤں میں سرخ گلبدنی کا پاجامہ، پنڈلیوں پر سے تنگ اور اوپر جا کر کسی قدر ڈھیلا، کبھی کبھی ایک بر کا پاجامہ بھی پہنتے تھے مگر کسی قسم کا بھی ہو ہمیشہ ریشمی اور قیمتی ہوتا تھا۔ چوڑا سرخ نیفہ، انگرکھے کی آستینیں آگے سے کٹی ہوئی، کبھی لٹکتی رہتی تھیں اور کبھی پلٹ کر چڑھا لیتے تھے سر پر گلشن کی بڑی دو پلڑی ٹوپی، اس کے کنارے پر باریک لیس، ٹوپی اتنی بڑی تھی کہ سر پر اچھی طرح منڈھ کر آ گئی تھی۔ اندر سے مانگ اور ماتھے کا کچھ حصہ اور بال صاف جھلکتے تھے۔ غرض یہ کہ نہایت خوش پوشاک اور جامہ زیب آدمی تھے۔ جب ہم دونوں پہنچے تو صاحب عالم مرزا رحیم الدین حیاؔ سے کہہ رہے تھے کہ ”صاحب عالم! تمہارے شطرنج کے نقشوں نے میرا ناک میں دم کر دیا ہے ایک ہوں، دو ہوں۔ آخر یہ روز روز کی فرمائشیں کوئی کہاں تک پوری کرے“! صاحب عالم نے کہا ”استاد! کیا کروں ریزیڈنٹ بہادر کے پاس ولایت سے حل کے لئے شطرنج کے نقشے آیا کرتے ہیں۔ کچھ تو میں خود حل کر کے ان کے پاس بھیج دیتا ہوں جو سمجھ میں نہیں آتے وہ آپ کے پاس لے آتا ہوں“ حکیم صاحب نے نظر اٹھا کر ہماری طرف دیکھا۔ ”بیٹھیے، بیٹھیے“ ہم بیٹھ گئے اور وہ پھر صاحب عالم کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے ”میاں حیا! جو نقشہ تم لائے ہو وہ میرے خیال میں کچھ پیچیدہ نہیں ہے۔ تم کہتے ہو سرخ مہروں کو مات ہوگی، میں کہتا ہوں نہیں سبز کو ہوگی۔ تم بساط بچھاؤ“ میں ابھی سمجھائے دیتا ہوں۔ ”اچھا پہلے ذرا مولوی صہبائی سے بات کر لوں اور میاں سکھانند تم بیٹھے انتظار کرتے رہو۔ میں حکم لگا چکا ہوں کہ جب تک پورب کی طرف سے اس چھپکلی کا جوڑا نہ آ جائے

یہ ساپنے کی دیوار سے نہ جائے گی۔ اس کا جوڑا آپ پر آئے" سکھانند حکیم
رقم تخلص کرتے تھے۔ دھرم پورے میں رہتے تھے کوئی ۴۰ سال کی عمر تھی
بیچ میں شاہ نصیر کے اور دلّی میں خاں صاحب کے شاگرد تھے بڑے
خوش پوشاک، خوش وضع، خوش اخلاق، ظریف الطبع، حلیم، خوش صورت اور شکیل آدمی تھے
استاد کا ایسا ادب کرتے تھے جیسے کوئی بیٹا باپ کا کرتا ہے۔ حکیم صاحب کی باتیں
سنکر "بہت خوب، بہت مناسب" کہتے رہتے۔ ان سے گفتگو کر کے حکیم صاحب ہماری طرف
متوجہ ہوئے اور کہنے لگے "ارے بھئی صہبائی! تم کئی دن سے نہیں آئے کہو
خیریت تو ہے اور آپ کے ساتھ یہ کون صاحب ہیں" مولوی صہبائی نے کہا "یہ
پہلے کالج میں میرے شاگرد تھے اب مطبع کھول لیا ہے وہاں مشاعرہ کرنا چاہتے ہیں
آپ کو تکلیف دینے آئے ہیں" حکیم صاحب نے ہنس کر کہا "بس صاحب مجھے تو
معاف کیجئے۔ اب دہلی کے مشاعرے شریفوں کے جانے کے قابل نہیں رہے
ایک صاحب ہیں[1] وہ اپنی امت کو لے کر چڑھ آتے ہیں شعر سمجھنے کی تو کسی کو تمیز نہیں
مفت میں واہ واہ! سبحان اللہ، سبحان اللہ کا غل مچا کر طبیعت کو منغض کر دیتے ہیں
یہ نہیں سمجھتے کہ ؎ صائب دو چیز می شکند قدر شعر را
تحسین ناشناس و سکوت سخن شناس

دوسرے صاحب ہیں وہ ٹھڈ ٹھڈ کو ساتھ لئے پھرتے ہیں اور خواہ مخواہ استادوں
پر حملہ کرتے ہیں۔ خود تو میدان میں نہیں آتے اپنے نااہل چیلوں کو مقابلے میں لاتے ہیں
اس روز جو اس جانور نے یہ شعر پڑھا ؎

مرکز محور گردوں بہ لب آب نہیں
ناخن قوس قزح شبہ مضراب نہیں

کہا کہ یہ غالب کے رنگ میں لکھا ہے۔ تو میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کس قدر ناگوار

---

[1] یہ استاد ذوق اور شہزادوں کی طرف اشارہ ہے۔

گزرا۔ غالبؔ کے رنگ میں شعر کہتا تو کجا وہ یا اُن کے اُستاد پہلے مرزا نوشہ کے شعروں کو سمجھ تو لیں۔ اب رہے صہبائی صاحب[1] تو ان کی بات دوسری ہے۔ وہ بھی واہیات بکتے ہیں مگر کسی پر حملہ تو نہیں کرتے بلکہ ان کی وجہ سے مشاعرے میں چہل پہل ہو جاتی ہے۔ بھئی میں نے اسی وجہ سے مشاعروں میں جانا ہی ترک کر دیا ہے" میں نے عرض کی کہ اس مشاعرے میں استاد ذوقؔ اور مرزا نوشہ نے آنے کا وعدہ کر لیا ہے۔ حضرت ظلِ سبحانی کی غزل بھی آئے گی" فرمایا "ہر شخص مختار ہے چاہے غزل بھیجے۔ میں تو نہ آؤں گا۔ غزل بھیجوں گا" یہ باتیں ہی ہو رہی تھیں کہ ایک بنارس کا سوداگر کپڑوں کے دو گٹھے لے کر آیا۔ شہر میں جب کوئی کپڑوں کا سوداگر آتا تو حکیم صاحب کے پاس آنا لازمی تھا۔ ریشمی کپڑوں سے ان کو عشق تھا کوئی کپڑا پسند آ گیا تو قیمت کی پروا نہیں کرتے تھے جو مانگتا دیتے۔ اس سوداگر نے آ کر ایک گٹھری مزدور کے سر پر سے اتاری۔ اس میں سے پٹ ایک چھپکلی نیچے گری اور دوڑ کر سامنے کی دیوار پر جو جمی بیٹھی تھی وہ لپک کر اس سے آملی اور دونوں مل کر ایک طرف چلی گئیں۔ ہم لوگ بیٹھے یہ تماشہ دیکھ رہے۔ جب دونوں چھپکلیاں چلی گئیں تو حکیم صاحب نے کہا "کہو میاں رقم تم نے دیکھا" انھوں نے کہا۔ "جی ہاں" "ایک فاصلے کے حساب لگانے میں مجھ سے غلطی ہوئی۔ میں نے جو اپنی رائے پر اصرار کیا تھا اس کی معافی چاہتا ہوں" کہنے لگے "بھئی انسان ہی سے تو غلطی ہوتی ہے۔ ہاں تو بھئی صہبائی[2] مشاعرے کے متعلق ہمارا صاف جواب ہے" میں نے جب دیکھا کہ خاں صاحب ہاتھوں سے نکلے ہی جا رہے ہیں تو مجھے نواب زین العابدین کا آخری نسخہ یاد آیا۔ میں نے کہا "مجھے تو اس

---

[1] ان کا مفصل حال آگے آئے گا۔ [2] یہ واقعہ ہے اس کے دیکھنے والے ایک صاحب کا ابھی کوئی بیس برس ہوئے انتقال ہوا ہے یہ واقعہ خود ان کی زبانی سنا ہے۔

مشاعرے سے برائے نام تعلق ہے، سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں عارف کا ہے وہ بہت بیمار ہو گئے ہیں اور ان کو اب زندگی کی امید نہیں رہی۔ ان کی آخری خواہش ہے کہ مرتے مرتے ایک ایسا مشاعرہ دیکھ لوں جس میں دہلی کے تمام کاملین فن جمع ہوں۔ وہ خود حاضر ہوتے مگر حکیم احسن اللہ خاں صاحب نے ان کو کہیں آنے جانے سے منع کر دیا ہے۔" یہ آخری فقرہ میں نے اپنی طرف سے بڑھا دیا۔ خاں صاحب بڑے غور سے میری بات سنتے رہے۔ جب خاموش ہوا تو مولوی امام بخش صاحب کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگے "افسوس ہے کیا خوش فکر اور ذہین شخص ہے۔ یہ عمر اور یہ مایوسی سچ ہے ہمیشہ رہے نام اللہ کا" میری طرف دیکھ کر کہا "اچھا بھئی تم جاؤ، میری طرف سے عارف سے کہہ دینا کہ میاں میں ضرور آؤں گا۔" جب میں نے دیکھا کہ یہ جادو چل گیا تو اور پاؤں پھیلائے اور کہا "نواب صاحب نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ہو سکے تو صہبائی صاحب، مفتی صدر الدین صاحب اور نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ کو بھی اپنے ہمراہ لائیے گا تو عنایت ہوگی۔" حکیم صاحب کہنے لگے "میاں صہبائی سے تو میں ابھی کہے دیتا ہوں۔ اب رہے آزردہ اور شیفتہ تو واپس جاتے جاتے ان سے بھی کہتے جاؤ۔ یہ کہہ دینا کہ میں نے تم کو بھیجا ہے۔ ہاں تاریخ کیا مقرر کی ہے، مشاعرہ کہاں ہوگا اور طرح کیا ہے؟" میں نے تاریخ بتا کر مکان کا پتا دیا۔ طرح کے متعلق حضرت جہاں پناہ کے حضور میں جو گفتگو ہوئی تھی وہ بیان کی۔ کہنے لگے "ہمارے بادشاہ سلامت بھی عجیب چیز ہیں۔ جو بات کہتے ہیں بہت ہی سوچی سمجھی ہے۔ شاید ایسا مشاعرہ کہیں بھی نہ ہوا ہوگا جس میں "طرح" نہ دی گئی ہو۔ خیر یہ تو اچھا ہوا جھگڑے کا جھونپڑا ہی نہیں رہا مگر بھئی بات یہ ہے کہ جب تک مقابلے کی صورت نہ ہو نہ شعر کہنے میں جی لگتا ہے اور نہ پڑھنے میں لطف آتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کتاب دیکھنے میں مشغول ہو گئے اور میں سلام کر کے رخصت ہوا۔

چتلی قبر کے قریب حویلی عزیز آبادی کے سامنے مفتی صدر الدین صاحب کا مکان تھا، اس کے نزدیک بیٹا محل میں نواب مصطفیٰ خاں صاحب شیفتہ رہتے ہیں۔ مفتی صاحب کے ہاں جا کر معلوم ہوا کہ شیفتہ بھی مفتی صاحب ہی کے پاس بیٹھے ہیں، میں نے کہا چلو، اس سے بہتر موقع ملنا مشکل ہے، دونوں سے ایک جگہ ملنا ہو گیا یہ سوچ کر اندر گیا، مکان کوٹھی کے نمونے کا ہے انگریزی اور ہندوستانی دونوں وضع کو ملا کر بنایا گیا ہے۔ صحن بہت بڑا نہیں ہے۔ اس میں مختصر سی نہر ہے، سامنے دالان در دالان اور پہلو میں انگریزی وضع کے کمرے ہیں، باہر کے دالان میں کواڑ لگا کر اس کو بھی کمرے کی شکل کا کر دیا ہے۔ دالانوں کے سامنے اونچا چبوترہ ہے، چبوترہ کے اوپر تخت بچھے ہوئے ہیں، اس پر چاندنی کا فرش اور دو طرف گاؤ تکیے لگے ہوئے تھے، تختوں پر مفتی صاحب اور نواب صاحب بیٹھے باتیں کر رہے تھے، مفتی صاحب کی عمر ہوگی ۷۵، ۷۶ سال کی، بھی گرا ہوا جسم سانولا رنگ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، ذرا اندر کو دھنسی ہوئیں بھری ہوئی داڑھی، بہت سیدھی سادھی وضع کے آدمی ہیں، ظاہری نمائش سے کوئی سروکار نہیں، لباس سفید اور ایک برکا پاجامہ، سفید کرتہ اور سفید ہی دوپٹہ جامہ زیبی میں حکیم مومن خاں کے بعد دہلی میں نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ ہی کا نمبر تھا ان کا رنگ گہرا سانولا تھا لیکن ناک نقشہ غضب کا پایا تھا، اس پر نیچی سیاہ گول داڑھی

ل پہلے زمانے میں شرفا گھر پر بھی پورا لباس پہنے رہتے تھے، زنانے میں جانے کے خاص خاص وقت تھے ورنہ سارا وقت مردانے ہی میں گزرتا تھا۔ ہر وقت کوئی نہ کوئی ملنے جلنے والا پاس بیٹھا رہتا۔ عالم ہوئے تو درس کا حلقہ ہوتا، شاعر ہوئے تو شعر کا چرچا رہتا۔ غرض کوئی وقت بے کار نہ گزرتا۔ خاص خاص دوستوں سے ہنسی مذاق کی گفتگو ہوتی ورنہ عام طور پر اپنے کو بہت لئے دیئے رہتے جہاں جاؤ یہی معلوم ہوتا کہ دربار لگا ہوا ہے۔ ہر شخص دوزانو مودب بیٹھا ہے۔ بے ضرورت نہ بات کی جاتی ہے نہ جواب دیا جاتا ہے۔ کوئی ہنسی کی بات ہوئی تو ذرا مسکرا دیئے کھلکھلا کر ہنسنا معیوب اور بڑھ بڑھ کر بولنا یا اونچی آواز میں بات کرنا خلاف ادب سمجھا جاتا ہے۔

بہت بھلی معلوم ہوتی تھی، جسم کسی قدر بھاری اور قد متوسط تھا۔ لباس میں بھی زیادہ
تکلف نہیں کرتے تھے۔ تنگ مہری کا سفید پاجامہ، سفید کرتہ، نیچی چولی کا انگرکھا اور قبہ نما
پیچ گوشہ ٹوپی پہنتے تھے تقریباً ۳۵، ۴۰ سال کی عمر تھی۔ میں آداب کر کے تخت کے ایک
کونے پر دوزانو بیٹھ گیا۔ مفتی صاحب نے آنے کا سبب پوچھا۔ میں نے حکیم مومن خاں
کا پیام پہنچا دیا۔ مفتی صاحب نے بڑے تعجب سے پوچھا "کیوں! خاں صاحب نے تو مشاعرے
میں نہ جانے کا عہد کر لیا ہے؟ بھئی شیفتہ! یہ کیا معاملہ ہے؟ یا تو خود نہیں جاتے
تھے یا دوسروں کو بھی ساتھ گھسیٹ رہے ہیں۔" میں نے نواب زین العابدین خاں
عارف کا واقعہ بیان کیا۔ کہنے لگے "ہاں یہ بات ہے ورنہ مجھے تو یہ سنکر حیرت ہوئی تھی
کہ حکیم صاحب اور مشاعرے میں جائیں۔ اچھا بھئی عارف سے کہدینا کہ میں اور شیفتہ
دونوں آئیں گے۔" یہاں سے چھٹی ہوئی تو میں سمجھا کہ گویا گنگا نہا لیا۔ خوشی خوشی آکر نواب
زین العابدین خاں سے واقعہ بیان کیا وہ بھی مطمئن ہو گئے۔ میں نے حکیم مومن خاں کا جب
حال بیان کیا تو ان کے آنسو نکل آئے کہنے لگے "میاں کریم الدین! ہم کو یہ کبھی معلوم ہے
کہ میری حکیم صاحب سے صفائی نہیں ہے۔" میں نے کہا "نواب صاحب! آپ کیا فرماتے
ہیں ان پر تو آپ کی بیماری سننے کا ایسا اثر ہوا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ شاید ان کا سگا بھائی بھی بیمار
ہوتا تو اتنا ہی اثر ہوتا۔ مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ انھوں نے مشاعروں میں نہ جانے کا عہد
کر لیا تھا صرف آپ کی وجہ سے انھوں نے یہ عہد توڑا ہے۔" نواب صاحب نے کہا "بھئی ہم کو
ان لوگوں کی محبتوں کا کیا حال معلوم؟ یہ لوگ وہ ہیں کہ اپنے دشمن کو بھی مصیبت میں نہیں
دیکھ سکتے۔ خیر اس کو جانے دو۔ اب یہ بتاؤ کہ تمہارا مکان خالی ہو گیا یا نہیں؟" میں نے کہا
"جی ہاں بالکل خالی ہے حکم ہو تو میں بھی خدمت میں حاضر کر دوں۔" فرمایا "نہیں بھئی
نہیں جہاں دو آدمیوں نے مل کر کسی کام میں ہاتھ ڈالا اور وہ خراب ہوا۔ تم اس انتظام
کو بس مجھ پر چھوڑ دو۔ میں جانوں اور میرا کام۔ بلکہ تم ادھر آنا بھی نہیں۔ تم نے اگر
مین میخ نکالی تو مجھ پر دوہری تہری ذمہ داری پڑ جائے گی۔"

۲۔ ترتیب

بشعر و سخن مجلس آراستند ٭ نشستند و گفتند و برخاستند

میں تاریخ ابو الفدا کے ترجمے میں ایسا گتھا گیا کہ ۷، ۸ روز تک گھر سے باہر ہی نہ نکلا۔ نواب زین العابدین خاں کے شوق کی یہ حالت تھی کہ باوجود کمزوری نقاہت کے روز صبح ہی سے جو باہر نکلتے تو کہیں رات کے آٹھ نو بجے جاکر ان کی صورت گھر میں دکھائی دیتی۔ اس لئے ان سے ملنا نہیں ہوا کہ کچھ حال پوچھتا۔ بہرحال یہ آٹھ دن آنکھ بند کرتے گزر گئے اور مشاعرے کی تاریخ آ ہی گئی۔ ۱۴ رجب کو شام کے ساڑھے سات بجے کے قریب میں بھی مشاعرے میں جانے کو تیار ہوا۔ نواب صاحب کو دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ صبح سے جو گئے ہیں تو اب تک واپس نہیں آئے۔ گھر سے جو نکلا تو بازار میں بڑی چہل پہل دیکھی ہر شخص کی زبان پر مشاعرے کا ذکر تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ یہ میاں کریم الدین کون ہے، کوئی کہتا کہ بھئی کوئی ہوں مگر انتظام ایسا کیا ہے کہ دیکھکر جی خوش ہوتا ہے۔ میں یہ باتیں سنتا اور دل میں خوش ہوتا ہوا قاضی کے حوض پر آیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ سڑک کے دونوں جانب ٹٹیاں لگا کر اور ان میں روشنی کے گلاس جما کر رات کو دن کر دیا گیا ہے۔ سڑک پر خوب چھڑکاؤ ہے۔ کوڑا نہ ہو رہا ہے۔ مبارک النساء بیگم کی حویلی کے بڑے پھاٹک کو گلاسوں، قمقموں اور قندیلوں سے سجا کر گلزار رنگین کر دیا ہے۔ صدر دروازے اندر کی دہلیز تک روشنی کا یہ عالم ہے کہ آنکھوں میں چکا چوند آتی ہے۔ مکان کے اندر جو قدم رکھا تو ہوش جاتے رہے یا اللہ یہ میرا ہی مکان ہے یا کسی شاہی محل میں آگیا ہوں۔ گھڑی گھڑی آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چاروں طرف دیکھتا اور کہتا "واہ میاں عارف واہ تم نے تو کمال کر دیا۔ کہاں تو وہ بیچارے کریم الدین کا مکان

اور کہاں یہ بادشاہی ٹھاٹھ واقعی تمہارا کہنا صحیح تھا اگر دو ہزار میں بھی کام نکل جائے
تو یہ سمجھو کہ کچھ نہیں اٹھا۔ چونے میں ابرک ملا کر مکان میں قلعی کی گئی تھی جس کی وجہ سے
در و دیوار ایسے چمک دمک رہے تھے۔ صحن کو بھروا کر تختوں کے چوکے
اس طرح بچھائے تھے کہ چبوترہ اور صحن برابر ہو گئے تھے۔ تختوں پر دری چاندنی کا
فرش، اس پر قالینوں کا حاشیہ، پیچھے گاؤ تکیوں کی قطار، جھاڑ، فانوس، ہانڈیاں
دیوارگیریاں، قمقمے، چینی قندیلیں اور گلاسوں کی وہ بہتات تھی کہ تمام مکان بقعۂ نور
بن گیا تھا۔ جو چیز تھی خوبصورت اور جو شے تھی قرینے سے۔ سامنے کی صف کے بیچوں بیچ
چھوٹا سا سبز مخمل کا کارچوبی شامیانہ لگا تھا جس کی چوبوں پر سنہری پتی، طنابوں سے
استادہ تھا۔ اس کے نیچے سبز مخمل کی کارچوبی مسند، پیچھے سبز کارچوبی گاؤ تکیہ، چار چوبوں
پر چھوٹے چھوٹے آٹھ چاندی کے فانوس نصب تھے۔ فانوسوں کے کنول بھی سبز
چوبوں کے سنہری کلسوں سے لٹکا کر نیچے تک موتے موتیا کے گجرے سہرے کی
طرح لٹکے ہوئے، بیچ کی لڑیوں کو سمیٹ کر کلابتونی ڈوریوں سے جن کے کونوں پر
مقیش کے گچھے تھے اس طرح چوبوں پر کس دیا گیا تھا کہ شامیانے کے چاروں طرف
پھولوں کے دروازے بن گئے تھے۔ دیواروں میں جہاں کھونٹیاں تھیں وہاں کھونٹیوں
اور جہاں کھونٹیاں نہیں تھیں وہاں کیلیں لگا کر پھولوں کے ہار لٹکا دیئے تھے۔
اس سرے سے لیکر اس سرے تک شہ نشین کی چھت گیری جس کا حاشیہ سبز تھا کھنچی
ہوئی تھی۔ چھت گیری کے بیچوں بیچ موتیا کے ہار لٹکا کر لڑیوں کو چاروں طرف
اس طرح کھینچ دیا گیا تھا کہ پھولوں کی چھتری بن گئی تھی۔ ایک صحنچی میں پانی کا انتظام
تھا۔ کورے کورے گھڑے رکھے تھے اور شورے میں جست کی صراحیاں لگی ہوئی تھیں
دوسری صحنچی میں پان بن رہے تھے۔ باورچی خانے میں حقوں کا تمام سامان سلیقے سے

لہ سبز رنگ دہلی کا شاہی رنگ تھا۔

جما ہوا تھا، جا بجا نوکر صاف ستھرے لباس پہنے دست بستہ مؤدب کھڑے تھے، تمام
مکان مشک و عنبر اور اگر کی خوش بو سے بڑا مہک رہا تھا۔ قالینوں کے سامنے تھوڑے
تھوڑے فاصلے پر حقوں کی قطار لگی تھی۔ حقے ایسے صاف ستھرے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ ابھی
دکان پر سے خرید کر آئے ہیں۔ حقوں کے بیچ میں جو کچھ جگہ چھوٹ گئی تھی وہاں چھوٹی چھوٹی
تپائیاں رکھ کر ان پر خاصدان رکھ دیئے تھے، خاصدانوں میں لال قند کی صافیوں میں
لپٹے ہوئے پان۔ گلوریوں کو صافی میں اس طرح جمایا تھا کہ بیچ میں ایک ایک تہہ پھولوں
کی آگئی تھی، خاصدانوں کے برابر چھوٹی چھوٹی کشتیاں، ان میں الائچیاں، چکنی ڈلیاں اور
بن دھنیا۔ مسند کے سامنے چاندی کے دو شمعدان، اندر کافوری بتیاں، اوپر ہلکے
سبز رنگ کے چھوٹے کنول۔ شمعدانوں کے نیچے چاندی کے چھوٹے لگن، لگنوں میں عرق
کیوڑہ، غرض کیا کہوں ایک عجیب تماشا تھا۔ میں تو الف لیلا کا ابوالحسن ہوگیا، جدھر نظر
جاتی ادھر ہی کی ہو رہتی۔ میں اس تماشے میں محو تھا کہ لوگوں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا۔

سب سے پہلے مرزا کریم الدین رسا آئے۔ یہ سلاطین زادے ہیں۔ کوئی ستر
برس کے پیٹے میں ہیں۔ استعداد علمی تو کم ہے مگر شاعری میں اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتے
بہت رحم دل، خوش خلق اور سادہ مزاج ہیں۔ دخل فصل نام کو نہیں ہے۔ ملاح کہا کرتے ہیں کہ "کشتی
میں چڑھے سب سے پہلے اور اترے سب سے پیچھے۔" انہوں نے اس مقولے کو مشاعرے سے متعلق
کر دیا ہے۔ مشاعرے میں سب سے پہلے آتے ہیں اور جب تک ایک ایک کر کے سب نہیں چلے جاتے
یہ اٹھنے کا نام نہیں لیتے۔ ایک روز کا واقعہ ہے کہ مشاعرہ ہو رہا تھا، بڑے زور سے
ابر آیا۔ سب نے جلدی جلدی مشاعرہ ختم کیا، لوگ اپنے اپنے گھر گئے لیکن یہ
ٹھہرے اپنی وضع کے پابند، جب تک سب نہ چلے جاتے اپنی جگہ سے نہ اٹھے۔ ہاں
گھڑی گھڑی جھک جھک کر آسمان دیکھ لیتے تھے، اتنے میں موسلا دھار مینہ

۱؎ بزرگوں کی زبانی دیوان عام کے مشاعروں کا جو حال میں نے سنا ہے بجنسہٖ اسی پر
اس مشاعرے کا نقشہ قائم کیا ہے۔

برسنا شروع ہوا۔ ایسا برسا کہ جل تھل بھر گئے کہیں دو گھنٹے کے بعد خدا خدا کر کے
مینھ تھما تو یہ بھی اٹھے مگر ایسا اندھیر الگھپ تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہیں سوجھتا تھا مالک
ان نے ایک نوکر قندیل دے کر ساتھ کر دیا۔ گلیوں میں ٹخنوں ٹخنوں پانی تھا۔ ان
بچارے کے پاؤں میں زردوزی کا قیمتی جوتہ، کیچڑ میں پاؤں رکھیں تو کیسے رکھیں
آخر چپکے سے نوکر سے کہا تو اپنا جوتہ مجھے دیدے۔ اس کا جوتہ کیا تھا لیتڑے سے تھے،
وہی گھسیٹتے ہوئے چلے، اپنا جوتہ بغل میں دبا لیا۔ قلعہ پہنچ کر ایک نیا جوتہ نوکر کو دیا
اور کہا "میاں تو نے آج میرے ساتھ ایسا احسان کیا ہے کہ تمام عمر نہ بھولوں گا جب
کبھی تجھے کوئی ضرورت ہو تو میرے پاس آجایا کیجیو" آگے چل کر اس بدمعاش نے
ان کو بہت دق کیا۔ اول تو اس راز کا ڈھنڈورا پیٹ دیا، دوسرے تیسرے
چوتھے ان سے ایک دو روپے مار لاتا۔ مگر انھوں نے کبھی "نا" نہیں کی، جب
جاتا کچھ نہ کچھ سلوک ضرور کرتے۔

نواب زین العابدین خاں صاحب نے بڑھ کر لب فرش ان کو لیا اور پوچھا
"ہیں، صاحب عالم! میاں چھجا آپ کے ساتھ نہیں آئے؟" مرزا رحیم الدین چھجا
ان کے بڑے بیٹے ہیں، لیکن تھوڑے دنوں سے باپ بیٹے میں کچھ صفائی نہیں
رہی ہے۔ نواب صاحب کا اتنا کہنا تھا کہ صاحب عالم ناسور کی طرح پھوٹ بہے کہنے
لگے "نواب صاحب! وہ بھلا میرے ساتھ کیوں آنے۔ جب سے مختار ہوگئے ہیں
ان کا تو رنگ ہی بدل گیا ہے۔ میں بیچارہ تو کس گنتی میں ہوں وہ کسی کو بھی اب خاطر میں نہیں
لاتے۔ پالا پوسا، بڑا کیا، پڑھایا لکھایا، شاعر بنایا، تیر پٹا سکھایا اور تخت کی قسم

ف روز روز کی خانہ جنگیوں نے ہر شہزادے کے دل میں یہ خیال پیدا کر دیا تھا کہ شاید
کل میں ہی بادشاہ ہو جاؤں اس لئے قلعہ کے سب لوگ خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین
زادے ہمیشہ تخت و تاج کی قسمیں کھایا کرتے تھے۔

... نسخے پیروں کے بتاتے ہیں کہ قلعہ تو قلعہ ہندوستان بھر میں کسی کے فرشتہ خاں کو بھی معلوم نہ ہوں گے اور اب وہی صاحبزادے صاحب ہیں کہ استاد ماننا تو درکنار مجھ کو باپ بھی کہتے شرماتے ہیں۔ ہاں بھئی کیوں نہ ہو تیرھویں صدی ہے۔ ان کو بتائیں نہ کچھ کریں تو مصیبت میں آ گیا۔ ایک نقصان مایہ دوسرے شماتت ہمسایہ۔ بیٹھا ہاتھ سے گیا تو گیا، دن رات کی دانتا کلکل اور رول لے لی۔" یہ باتیں کرتے کرتے تو نواب حاجب نے میاں رسا کو لے جا کر ایک جگہ بٹھا دیا۔ ابھی ان سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ شہزادوں کا ایک گروہ حافظ عبدالرحمٰن احسان کو جھرمٹ میں لئے آ پہنچا۔ بھلا دلی شہر میں کون ہے جو حافظ جیو کو نہ جانتا ہو۔ جگت استاد ہیں۔ پہلے تو قلعہ کا قلعہ ان کا شاگرد تھا مگر استاد ذوق کے قلعے میں قدم رکھتے ہی ان کا زور ذرا ٹوٹا۔ یہ بھی زمانے کی آنکھیں دیکھے ہوئے تھے۔ اور شاہ نصیر سے ٹکر لڑا چکے تھے۔ اس بڑھاپے میں بھی خم ٹھونک کر سامنے آ گئے اور مرتے دم تک مقابلے سے نہ ہٹنا تھا نہ ہٹے۔ کوئی ۹۰ برس کی عمر تھی کمر دوہری ہونے سے قد کمان بن گیا تھا۔ اپنے زمانے کے بلعم باعور تھے لیکن غزل اس کڑاکے سے پڑھتے تھے کہ تمام مشاعرے پر چھا جاتے تھے۔ ان کی استادی کا سکہ ایک زمانے سے تمام دلی پر بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے مرزا قتیلی کے استاد ہوئے۔ رفتہ رفتہ شاہ عالم بادشاہ غازی نور اللہ مرقدہ تک رسائی ہو گئی۔ وہ ان کو حافظ جیو کہتے تھے۔ اس لئے اسی نام سے تمام قلعے میں مشہور تھے۔ مصرعے پر مصرعہ لگانے میں کمال تھا اور سند ایسے تڑاخ سے دیتے تھے کہ معترض منہ دیکھتے رہ جاتے تھے

ایک روز بادشاہ سلامت نے مصرعہ کہا ؎

"صبح بھی بوسہ تو دیتا مجھے اے ماہ نہیں"

انھوں نے فوراً عرض کی ؎

"نامناسب ہے میاں وقت سحرگاہ نہیں"

کسی نے "وقت سحرگاہ" کی ترکیب پر اعتراض کیا۔ انھوں نے جھٹ صائب کا

یہ شعر پڑھا ؎

آدمی پیر چو شد، حرص جواں می گردد
خواب در وقتِ سحرگاہ گراں می گردد

اور معترض صاحب اپنا سا منھ لے کر رہ گئے۔

بڑے دبلے پتلے آدمی تھے، رنگ بہت کالا تھا، شاہ نصیر نے اسی رنگ کا خاکہ اس طرح اڑایا ہے ؎ اے خالِ رخِ یار تجھے ٹھیک بناتا
پر چھوڑ دیا حافظِ قرآن سمجھ کر

نواب صاحب نے ان سب کو بھی ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنی اپنی جگہ پر لا کر بٹھا دیا۔ ابھی ان کو بٹھلانے سے فارغ نہ ہوئے تھے کہ منشی محمد علی تشنہ ننگ دھڑنگ، نشے میں چور جھومتے جھامتے اندر آئے۔ نوجوان آدمی ہیں مگر عجیب حال ہے کبھی برہنہ پڑے پھرتے ہیں کبھی کپڑے پہن خاصے بھلے آدمی بن جاتے ہیں۔ کسی کے شاگرد نہیں اور پھر سب کے شاگرد ہیں۔ کبھی حکیم آغا جان عیشؔ سے اصلاح لینے لگتے ہیں کبھی استاد ذوقؔ کے پاس اصلاح کے لئے غزل لے آتے ہیں۔ ذہن بلا کا پایا ہے، لاکھوں شعر زبان کی نوک پر ہیں، شعر سنا اور یاد ہوا۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ کسی کی غزل سنی اور یاد کر لی، مشاعرے میں خود اپنے نام سے وہ غزل پڑھ ڈالی اور وہ بیچارا منھ دیکھتا رہ گیا۔ نواب صاحب آگے بڑھے۔ پوچھا "منشی جی! یہ کیا رنگ ہے؟" کہنے لگے "اصلی رنگ" "مشاعرہ کب شروع ہوتا ہے؟" نواب صاحب نے کہا "ابھی شروع ہوتا ہے آپ بیٹھئے تو سہی" خیر ایک کونے میں جا کر بیٹھ گئے۔ میاں عارف نے ان پر ایک دوشالا لا کر ڈال دیا۔ انھوں نے اٹھا کر پھینک دیا۔ غرض جس طرح ننگے آئے تھے اسی طرح بلا تکلف بیٹھے رہے۔ اس کے بعد تو لوگوں کے آنے کا تانتا بندھ گیا جو آتا اس کا استقبال نواب صاحب کرتے اور لا لا کر بٹھاتے۔ حکیم مومن خاں آئے ان کے ساتھ آزردہ، شیفتہ، صہبائی اور مولوی مملوک علی تھے۔ مولوی صاحب مدرسۂ دہلی میں مدرس اوّل ہیں عجیب با کمال آدمی ہیں۔ مدرسے میں

ان کی ذات بابرکات سے وہ فیض ہوا ہے کہ شاید ہی کسی زمانے میں کسی استاد سے
ہوا ہو۔ بہت پابند شرع ہیں اس لئے خود شعر نہیں کہتے مگر سمجھتے ایسا ہیں کہ ان کا کسی
شعر کی تعریف کر دینا گویا اس کو دوام کی سند دینا ہے۔ کوئی ۹۰ سال کا سن ہجری سنہ کے
تو ننانوے کے ہیں مگر مدتوں سے دہلی میں آ رہے ہیں، دن رات پڑھنے پڑھانے سے
کام ہے۔ مشاعروں میں کم جاتے ہیں، یہاں شاید مولانا صہبائی ان کو اپنے ساتھ
گھسیٹ لائے تھوڑے ہی دن ہوئے بیچارے پابندی شرع اور تقویٰ کی وجہ سے
چکر میں آ گئے تھے، ہوا یہ کہ رزیڈنٹ بہادر مدرسے کے معائنہ کو آئے۔ ان کے علم
اور تقویٰ کے خیال سے ہاتھ ملایا۔ جب تک صاحب بہادر وہاں رہے انہوں نے
ہاتھ کو جسم سے اس طرح سے الگ رکھا جیسے کوئی نجس چیز کو دور رکھتا ہے۔ صاحب کے
جاتے ہی بہت احتیاط سے ہاتھ کئی بار دھویا۔ کسی نے جا کر صاحب سے یہ بات لگا دی
ان کو بہت غصہ آیا کہ ہم نے تو ہاتھ ملا کر ان کی عزت افزائی کی انہوں نے اس طرح
ہماری توہین کی۔ غرض بڑی مشکل سے یہ معاملہ رفع دفع ہوا۔

مولوی صاحب میرے بھی استاد تھے، میں بھی آگے بڑھا، آداب کیا، فرمانے لگے۔
"میاں کریم الدین! میں تم کو ایسا نہیں سمجھتا تھا، تم نے تو دہلی والوں کو مات
کر دیا۔ سبحان اللہ سبحان اللہ! کیا انتظام ہے، دیکھ کر جی خوش ہو گیا، خدا تمہیں اس سے
زیادہ حوصلہ دے۔" میں نے عرض کی "مولوی صاحب بھلا میں کیا اور میری بساط
کیا، یہ سب کیا دھرا نواب زین العابدین خاں کا ہے۔" فرمانے لگے "بھئی یہ بھی
اچھی ہوئی، وہ کہیں کہ سارا انتظام کریم الدین خاں کا ہے، تم کہو کہ نواب صاحب کا
ہے۔ چلو من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو۔" ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ مرزا نوشہ
پالکی میں سے اترے۔ نیر، علائی، سالک اور مجروح ان کے ہمراہ تھے۔
مرزا غالب، مومن خاں کی طرف بڑھے، مصافحہ کیا اور کہا "بھئی حکیم صاحب!
آج محمد ناصر خاں، محزوں کا عظیم آباد سے خط آیا تھا۔ تم کو بہت بہت سلام

لکھا ہے "معلوم نہیں کہ کیوں ایکا ایکی پٹنہ چلے گئے خواجہ میر درد کے پوتے
ہو کر ان کا دہلی کو چھوڑ کر جانا ہم کو تو پسند نہیں آیا۔ اب یاروں کو روتے ہیں، کیسا
کیا درد بھرا شعر لکھا ہے ؎

نہ تو نامہ ہے نہ پیغام زبانی آیا ؎ آہ محزوں مجھے یاران وطن بھول گئے

ارے بھئی رات تو خاصی آگئی ہے، ابھی تک میاں ابراہیم نہیں آئے، آخر یہ
مشاعرہ شروع کب ہوگا" حکیم صاحب کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ دروازے
کے پاس "السلام علیکم" کی آواز آئی۔ مولانا صہبائی نے کہا "لیجئے مرزا صاحب!
وہ استاد کے نشان کے ہاتھی حافظ ویران صاحب آگئے اور وہ آپ کے دوست
ہدہد بھی ساتھ ہیں، دیکھئے آج کس کے چونچ مارتے ہیں" میاں ہدہد کا نام عبدالرحمٰن
ہے پورب کے رہنے والے ہیں، دلی میں آکر حکیم آغا خان عیش کے ہاں ٹھہر گئے
ہیں۔ ان کے بچوں کو پڑھاتے ہیں، حکیم صاحب ہی کے مشورے سے ہدہد تخلص اختیار کیا
ان ہی کی تجویز سے چگی داڑھی رکھوا، سر منڈا کر عمامہ باندھا اور اس طرح خاصے
کھٹ بڑھئی ہوگئے۔ ان ہی کے ذریعے سے دربار میں پہنچے اور طائر الاراکین
شہپر الملک ہدہد الشعراء اشتہا جنگ بہادر خطابات پائے۔ شروع شروع میں
ان کے ظریفانہ کلام سے مشاعرہ چمک جاتا تھا مگر بعد میں انہوں نے استادوں پر
چوٹیں شروع کر دیں۔ کہتے تو یہ ہیں کہ حکیم صاحب کے اشارے سے ایسا کیا، لیکن کچھ بھی ہو
آخر سب کو ان سے کچھ نفرت سی ہوگئی اور بجائے دوسروں کا مذاق اڑانے کے
خود ان کا مذاق اڑ جاتا تھا۔ حکیم صاحب علانیہ تو ان کی مدد نہیں کر سکتے تھے، خود ان میں
اتنی قابلیت نہ تھی جو دلی والوں کی پھبتیوں کو سنبھال سکتے اس لئے تھوڑی دیر میں
ٹھنڈے ہو کر رہ جاتے مرزا نوشہ اور حکیم مومن خاں پر ہمیشہ منہ آتے تھے
اسی لئے مرزا نوشہ مولانا صہبائی کے منہ سے "آپ کے دوست" کا لفظ سن کر
مسکرائے اور کہا "بھئی میں تو ان کے منہ کیوں لگنے لگا مگر آج دیکھا جائے گا

"ہر فرعونے را موسیٰ"۔ سنتا ہوں کہ ہمارے میر صاحب مولوی ہُدہُد کی شان میں آج کچھ فرمانے والے ہیں۔ ان کے سامنے اگر یہ "شہبازِ سخن" تک گئے تو میں سمجھوں گا کہ بڑا کام کیا۔" غرض یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ استاد ذوق بھی اندر آ گئے۔ تمام قلعہ ان کے ساتھ آیا تھا، صاحب سلامت کر کے سب اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ قلعہ والوں اور ان لوگوں میں جن کا تعلق قلعہ سے ہے سلام کرنے کا عجیب طریقہ ہے۔ سیدھے کھڑے ہو کر دایاں ہاتھ اس طرح کان تک لے جاتے ہیں جس طرح کوئی نماز کی نیت باندھتا ہے اور پھر چھوڑ دیتے ہیں چلو سلام ہو گیا۔ باقی سب لوگوں سے معمولی طرح سلام کرتے ہیں۔ قلعہ والوں کی صورت کچھ ایسی ہے کہ ایک ہی نظر میں پہچان لئے جاتے ہیں، شہزادے ہوں یا سلاطین زادے سب کی وضع قطع ایک سی ہے۔ وہی لمبی گردن، وہی پتلی اونچی ناک، لمبا کتابی چہرہ، بڑی بڑی لمبوتری آنکھیں، بڑا دہانہ، اونچا چوکا، آنکھوں کے نیچے کی ابھری ہوئی ہڈیاں، گہرا سانولا رنگ، داڑھی گلوس پہ لٹکی تھوڑی پہ زیادہ۔ غرض جیسی مشابہت ان لوگوں میں ہے شاید ہی کسی خاندان والوں میں ہو گی۔ امیر تیمور سے لے کر اس وقت تک ان کی شکل میں کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ پہلے تو قلعہ بھر کا ایک ہی لباس[ھ] تھا۔ مگر اب کچھ دو رنگی ہو گئی ہے۔ وجہ

ھ اس مضمون میں جابجا دہلی والوں کے لباس کا ذکر آیا ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ذرا وضاحت سے اس لباس کو بتا دوں تاکہ پڑھنے والوں کی آنکھوں کے سامنے اس محفل کا نقشہ اور اچھی طرح پھر جائے۔ مرزا نوشہ کا ذکر جانے ہی دو وہ تو ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے ہیں ان کی ٹوپی دنیا بھر سے جدا تھی۔ نہ ترکی تھی نہ تاتاری۔ کھال کو (خواہ وہ سمور ہو یا برہ) اس طرح سی لیا جاتا تھا کہ نیچے کا گھیرا اوپر کے چندوے سے ذرا بڑا رہے۔ اس کے بعد چار کنگرے قائم کر کے کھال کو ٹوپی کی آدھی ملیان تک اس طرح کاٹ لیا کہ ٹوپی گرجے کی شکل بن گئی۔ بیچ میں چندوے کی جگہ مخمل یا گہرے رنگ کی بانات کنگروں کے کناروں سے ملا کر سی لی

(باقی برصفحہ ۳۸)

یہ ہوئی کہ جب سے سلیمان شکوہ کا اودھ کے دربار میں رسوخ ہوا خاندان کے کچھ لوگ
تو وہیں جا رہے ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ بنارس آنے جانے لگے ہیں جو وہاں جا کر آتا ہے
لباس میں نئی تراش خراش کرتا ہے۔ اس طرح اس کا لباس آدھا تیتر آدھا بٹیر ہو کر

(صفحہ ۳۷ سے پیوستہ) اندرا ستر دے دیا جاوے مرزا نوشہ کی ٹوپی ہو گئی۔ شہر میں کلاہ ترکی
کا بہت استعمال ہے جس کو عام اصطلاح میں چوگوشیہ ٹوپی کہتے ہیں۔ یہ بھی کئی وضع کی ہوتی ہیں اور
کئی طرح پہنی جاتی ہیں۔ جو ٹوپی شرفا استعمال کرتے ہیں اس کا دمہ (گوٹ) ذرا نیچا ہوتا ہے دمے کے
اوپر چار پاکھے۔ پاکھے کی وضع بالکل شاہجہانی محراب کی سی ہوتی ہے۔ دیواروں کو اس طرح ملا دیتے
ہیں کہ چاروں کونے نوک دار (کرخ) کے نمونے کے ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگوں نے اس میں ذرا جدت بھی
کی ہے۔ وہ یہ کہ دمے کو اونچا کر کے پاکھوں کی لمبان کو چوڑان سے کسی قدر بڑھا دیا ہے اور ان کے سل
جانے کے بعد جو بیل پیدا ہوئے ہیں ان کو پھر کاٹ کر کلیاں ڈال دی ہیں۔ اس طرح بجائے
چار بیل کے ٹوپی کے آٹھ بیل ہو گئے ہیں۔ خوبصورتی کے لئے دمے کے کناروں پر پتلی لیس اور
گوشوں کے کناروں پر باریک تیلون لگاتے ہیں۔ بادشاہ سلامت کی ٹوپی ہوتی تو اسی نمونے
کی ہے مگر سلے تک پیسے کے کام سے لپی ہوتی اور جا بجا موتی اور نگینے ٹنکے ہوتے۔ اس قسم کی ٹوپی
کئی طرح پہنی جاتی تھی۔ قلعہ والے تو پاکھوں کو کھڑا رکھتے ہیں۔ باقی لوگ ان کو کسی قدر دبا لیتے ہیں
جو ٹوپیاں بیل کی ہوتی ہیں اس کے پاکھوں کو تو اتنا دباتے ہیں کہ گوشے دمے کے باہر پھیل کر
کنول کی شکل بن جاتے ہیں۔ اس قسم کی ٹوپی ہمیشہ آڑی پہنی جاتی ہے اور وہ بھی اس طرح کہ
اس کا ایک کونہ بائیں بھوں پر کو دبائے۔ اس ٹوپی کے علاوہ ارخ چین کی ٹوپی کا بھی بہت رواج
ہے۔ اس کا بنانا کچھ مشکل کام نہیں۔ ایک مستطیل کپڑے کے کناروں کو سر کے ناپ کے برابر
سی لیا۔ نیچے پتلی سی گوٹ دے دی اور اوپر کے حصے میں چنٹ دے کر چھوٹا سا گول گتہ لگا دیا۔
دہلی کی دو پلڑی ٹوپی اور لکھنؤ کی ٹوپی میں صرف یہ فرق ہے کہ یہاں یہ ٹوپی اتنی بڑی بناتے
تھے کہ سر پر منڈھ جائے بخلاف اس کے لکھنؤ کی ٹوپی صرف بالوں پر مسری رہتی ہے۔ ان ٹوپیوں
کے علاوہ بعض بعض لوگ پانچ گوشیہ ٹوپی بھی پہنتے ہیں۔ اس ٹوپی میں پانچ گوشے ہوتے ہیں لیکن اس
کی کاٹ چوگوشیہ ٹوپی سے ذرا مختلف ہے۔ گوشوں کے اوپر کے حصے نوک دار ہوتے ہیں یوں سمجھ لو
کہ جیسے فصیل کے کنگورے۔ نیچے دمے کی بجائے پتلی سی گوٹ ہوتی ہے۔ یہ ٹوپی قالب پر چڑھا کر
پہنی جاتی ہے۔ قالب پر چڑھا کر بس جیسے ہمایوں کے مقبرے کا گنبد (باقی بر صفحہ ۳۹)

نہ لکھنؤ کا رہتا ہے نہ دہلی کا۔ اب جو لوگ یہاں بیٹھے ہیں ان ہی کو دیکھ لیجیے جو شاہزادے
لکھنؤ جا کر آئے ہیں ان کے سر پر لکھنؤ کی دو پلڑی ٹوپی ہے اونچی چولی کا انگرکھا ہے۔

(صفحہ ۳۸ سے پیوستہ) عام لوگوں میں بڑے گول چندوے کی ٹوپی کا بھی بہت استعمال
تھا۔ بعض تو بالکل سادی ہوتی ہیں اور بعض سوزنی کے کام یا بیتے کے کام کی ہوتی ہیں۔ اس ٹوپی کو
بھی قالب پر چڑھا کر پہنتے ہیں۔ لباس میں انگرکھا بہت پسند کیا جاتا ہے۔ انگرکھے کی چولی اتنی نیچی ہوتی
ہے کہ ناف تک آتی ہے۔ چونکہ ہر شخص کو کسرت کا شوق ہے اس لیے جسم کی خوبصورتی دکھانے کے لیے
آستینیں بہت چست رکھتے ہیں، اور بعض شوقین آستینوں کو آگے سے کاٹ کر الٹ لیتے ہیں۔ انگرکھے
کے نیچے کرتہ بہت کم لوگ پہنتے ہیں۔ قلعے والوں کے انگرکھے کے اوپر جامہ دار یا مخمل کی خفتان
ہوتی ہے۔ بہت تکلف کیا تو اس کے حاشیوں پر سمور لگا لیا، نہیں تو گوٹا ٹھپا لیس لگاتے ہیں۔
بٹنوں کی بجائے صرف ایک تکمہ اور گھنڈی ہوتی ہے جس کو "عاشق و معشوق" یا "چٹکے" کہتے ہیں۔
اس کی آستینیں ہمیشہ آدھی ہوتی ہیں۔ قلعے میں تو اس کو خفتان کہا جاتا ہے مگر شہر والے
اس بے بند کھلے نیمہ آستین کو "شہروانی" کہتے ہیں۔ انگرکھے کے اوپر جو کور شاہی رومال سہ گوشہ
کر کے پیٹھ پر ڈال لیتے ہیں۔ اس رومال کو عام اصطلاح میں "ادھ چھینا" کہتے ہیں۔ کمر میں بھی
پٹی کر کے رومال لپیٹنے کا رواج ہے مگر بہت کم۔ پاجامہ ہمیشہ قیمتی کپڑے کا ہوتا ہے۔ اکثر گلبدن،
غلطا، مشروع، موترے، اطلس یا گورنٹ کا ہوتا ہے۔ پرانی وضع کے جو لوگ ہیں وہ تو اب بھی
ایک برہی کا پاجامہ پہنتے ہیں مگر تنگ مہریوں کے پاجامے بھی چل نکلے ہیں۔ سلیم شاہی جوتی کا
استعمال شروع ہو گیا ہے پھر بھی دہلی کے شرفا ہتھیلی جوتی زیادہ پسند کرتے ہیں۔ شاید ہی شہر بھر
میں کوئی ہو گا جس کے ہاتھ میں بانس کی لکڑی اور گز بھر کا لٹھے کا چوکور رومال نہ ہو۔ ڈھونڈھ
ڈھونڈھ کر لمبی پور کا ٹھوس بھاری بانس لیتے ہیں، تیل پلاتے ہیں، مہندی مل کر باورچی خانے میں لٹکاتے
ہیں یہاں تک کہ اس کی رنگت بدلتے بدلتے سیاہ ہو جاتی ہے اور وزن تو ایسا ہو جاتا ہے گویا سیسہ پلا دیا ہے۔
جو نکلتا ہے اینٹھتا ہوا نکلتا ہے جس کا دیکھو چوڑا سینہ، پتلی کمر، تنے ہوئے ڈنڑ۔ شرفا میں تو شاید ڈھونڈے
سے ایک بھی نہ نکلے گا جس کو کسرت کا شوق نہ ہو اور بانک، بنوٹ اور لکڑی نہ جانتا ہو۔ بچپن ہی سے
ان فنون کی تعلیم دی جاتی ہے۔ مقابلے ہوتے ہیں، واہ واہ سے دل بچوں اور نوجوانوں کے
دل بڑھاتے ہیں اور فنون سپہ گری کو شرافت کا تمغہ سمجھتے ہیں۔

نیچے باریک شربتی ململ کا کرتہ اور تنگ پاجامہ ہے، جنھوں نے قلعہ کبھی نہیں چھوڑا، ان
کے جسم پر وہی پرانا لباس ہے، سر پر چوگوشیہ ٹوپی، جسم پر نیچی چولی کا انگرکھا، اس کے اوپر
مخمل یا جامہ وار کی خفتانی، پاؤں میں گلبدن یا غلطے کا ایک بر کا پاجامہ، جو لوگ لکھنؤ
ہو آئے ہیں انھوں نے دہلی کے لباس کے ساتھ داڑھی کو بھی خیرباد کہہ دیا ہے، چہرے
کی ساخت سے ان کو دہلی کا شہزادہ کہہ دو تو کہہ دو مگر لباس اور وضع قطع سے تو ٹھیٹھ
لکھنؤ والے معلوم ہوتے ہیں۔

استاد ذوق سب سے مل ملا کر شامیانے کے دائیں طرف بیٹھ گئے۔ شاعر ہیں کے
شعرا کو سلسلے سے بٹھانا بھی ایک فن ہے۔ نواب زین العابدین خاں کی تعریف کروں گا کہ
جس کو جہاں چاہا بٹھا دیا اور پھر اس طرح کہ کسی کو کوئی شکوہ نہ شکایت۔ اگر کوئی ایسی
جگہ بیٹھ جاتا جہاں ان کے خیال میں اس کو نہ بیٹھنا چاہیے تھا تو جا کر اس کو
وہاں سے اٹھاتے تو ویسی جگہ جا بیٹھتے، تھوڑی دیر کے بعد کہتے "ارے بھئی ذرا ایک
بات سننا" وہ آ کر ان کے پاس بیٹھ جاتا، اس سے باتیں کرتے رہتے، اتنے میں کوئی
ایسا شخص آ جاتا جس کو وہ خالی جگہ کے لیے موزوں سمجھتے، اس سے کہتے "تشریف
رکھیے، وہ جگہ خالی ہے" جب وہ جگہ بھر جاتی تو کسی بہانے سے اٹھ جاتے اور اس طرح
دو نشستوں کا انتظام ہو جاتا۔ شہزادوں کا سلسلے سے بٹھانا ذرا ٹیڑھی کھیر ہے، ذرا
ذرا سی بات پہ بگڑ کر اٹھ جاتے ہیں کہ واہ ہم اور یہاں بیٹھیں، پھر لاکھ منائیے دیکھیں
کیا ماننے والے ہیں۔ ان جھگڑوں کو استاد ذوق خوب سمجھتے تھے، اس لئے اپنے
ساتھ والوں کا انتظام انھوں نے خود کر لیا۔ مگر اس طرح کہ کسی کو یہ خیال بھی نہ ہوا
کہ یہ محفل کا بندوبست کر رہے ہیں۔ کسی سے کہتے "صاحب عالم ادھر آئیے" کسی
کسی خاص جگہ کی طرف اشارہ کر کے کہتے "وہ بیٹھو بھئی بیٹھو" ان سے تھوڑی دیر میں
پوری مجلس جم گئی۔ نشست کا یہ انتظام تھا۔ امیر شاہزادوں کے دائیں جانب وہ لوگ
جن کا تعلق قلعے سے تھا اور بائیں طرف شہر کے، درمیان میں استاد اور ان کے شاگرد

ایک چیز جو مجھے عجیب معلوم ہوئی وہ یہ تھی کہ قلعے والے جتنے آئے تھے سب کے ہاتھوں
میں بٹیریں دبی ہوئی تھیں۔ یہ بٹیر بازی اور مرغ بازی کا مرض قلعہ میں بہت ہے روزانہ
تیتروں بٹیروں اور مرغوں کی پالیاں ہوتی ہیں۔ ایک شہزادے صاحب نے تو کمال کیا
ہے ایک بڑے سے چھکڑے پہ ٹھاٹھر لگا کر چھوٹا سا گھر بنا لیا ہے اور اوپر چھت پر ٹٹی لگا
لگی ہوئی ہے۔ ٹھاٹھر میں خدا جھوٹ نہ بلائے تو لاکھوں ہی پدڑیاں ہیں جہاں جا جا
ھکڑا لے گئے اور پدڑیاں اڑا دیں۔ ایسی سدھی ہوئی ہیں کہ چھکڑے سے ایک بھی
ٹ کر نہیں جاتی۔ انھوں نے جھنڈی ہلائی اور وہ اڑیں۔ انھوں نے آواز دی
ر وہ آکر چھت پر بیٹھ گئیں۔

استاد ذوق کو آئے ہوئے چند ہی منٹ ہوئے ہوں گے کہ مرزا فتح الملک
اداریں آ پہنچے۔ ان کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ تھے۔ میاں داغ کی
ی سولہ سترہ برس کی عمر ہوگی۔ رنگت تو بہت کالی ہے مگر چہرے پر غضب کی نمایش
بڑی بڑی غلافی آنکھیں، ستواں ناک، کشادہ پیشانی، سر پر سیاہ مخمل کی لیس
ہوئی چوگوشیہ ٹوپی جس میں سلیسٹ کا انگرکھا، سبز گلبدنی پاجامہ، ہاتھ میں ریشمی
ل۔ ہیں تو ابھی نو عمر مگر شعر ایسا کہتے ہیں کہ سبحان اللہ شہر بھر میں ان کی غزلیں
جاتی ہیں۔ غرض ہوادار فرش سے ملا کر لگا دیا گیا۔ پہلے میاں داغ اترے اور
ر ایک طرف کھڑے ہوگئے۔ ان کے بعد مرزا فتح الملک اترے۔ ان کا نیچے قدم
اٹھا کر سب سرو قد کھڑے ہوگئے۔ چار چوبدار سبز گھنڈی دار پگڑیاں باندھے
بھی سبز بانات کی چپکنیں پہنے، سرخ شالی رومال کمر سے لپیٹے، ہاتھوں میں گنگا جمنی

مرزا فخرو کے ساتھ نواب مرزا خاں داغ کے آنے کی یہ وجہ تھی کہ نواب شمس الدین خاں کے
پھانسی پانے کے بعد ان کی بیوی یعنی داغ کی والدہ کا نکاح مرزا فخرو سے ہوگیا تھا اور اسی نسبت سے
قلعہ میں رہتے تھے۔ (نواب فتح الملک کا عرف مرزا فخرو تھا۔)

عصا اور مورچھل لیے ہوئے اُن کے پیچھے تھے۔ اِدھر مرزا فخرو نے فرش پر قدم رکھا اُدھر
عصا بردار تو سامنے آ گئے اور مورچھل بردار پیچھے ہٹ گئے۔ اس سلیقے سے یہ جلوس آہستہ آہستہ
شامیانے تک آیا۔ مرزا فخرو نے شامیانے کے قریب کھڑے ہو کر سب کو سلام لیا۔ پھر
چاروں طرف نظر ڈال کر کہا "اجازت ہے؟" سب نے کہا "بسم اللہ! بسم اللہ!" اجازت
پا کر یہ شامیانے میں گئے اور سب کو سلام کر کے بیٹھ گئے۔ دوسرے سب لوگ بیٹھنے
کی اجازت کے انتظار میں کھڑے تھے۔ ان سب کی طرف نظر ڈال کر کہا "تشریف رکھیے!"
سب لوگ سلام کر کے اپنی اپنی جگہ بیٹھ گئے۔ استاد **ذوق** نے **داغ** کو اپنے قریب ہی
ایک جگہ بیٹھنے کا اشارہ کیا، وہ وہاں جا بیٹھے۔ مورچھل بردار شامیانے کے پیچھے
اور عصا بردار سامنے کی صف کی پشت پر جا کھڑے ہوئے۔ جب یہ انتظام سب ہو گیا
تو نواب **زین العابدین خاں** آگے بڑھے، شاہزادے کے پاس جا کر
تسلیمات بجا لائے اور دو زانو ہو کر وہیں بیٹھ گئے۔ چپکے چپکے صاحب عالم سے
کچھ باتیں کیں اور پھر اٹھ کر اپنی جگہ جا بیٹھے۔ ان کے اٹھ کر اپنی جگہ جانے کے بعد
نواب **فتح الملک**[۱] نے دونوں ہاتھ فاتحہ کو اٹھائے۔ ساتھ ہی اہل مجلس نے
ہاتھ اٹھائے۔ فاتحہ خیر کے بعد صاحب عالم نے فرمایا "اے خوشنوایانِ چمن دہلی!
میری کیا بساط ہے جو آپ جیسے استادانِ فن کے ہوتے ہوئے میر مشاعرہ بننے کا
خیال بھی دل میں لا سکوں۔ صرف حضرت پیر و مرشد کے فرمان کی تعمیل میں حاضر
خدمت ہو گیا ہوں۔ ورنہ کہاں میں اور کہاں ایسے بڑے مشاعرے کی میر مجلسی! مجھ
اس مشاعرے کی ایک خصوصیت تو آپ کو معلوم ہے کہ اس کے لیے کوئی "طرح"
نہیں دی گئی۔ اس کی دوسری خصوصیت آپ یہ پائیں گے کہ بجائے ایک شمع کے
دو شمعیں گردش کریں گی، جس طرح "طرح" کے نکل جانے نے ایک دوسرے کے

۱؎ نواب فتح الملک بڑے پکے مسلمان تھے۔ کوئی کام بغیر فاتحہ کے شروع نہ کرتے تھے۔ اسی
لیے سب قلعہ والے ان کو "ملا" یا "ملیا" کہا کرتے تھے۔

مقابلے میں فخر و مباہات کا دروازہ بند کر دیا ہے" اسی طرح دو شمعوں کی وجہ سے پڑھنے میں تقدیم و تاخیر سے جو خیالات طبیعتوں کو مکدر کرتے تھے وہ بھی رفع ہو جائیں گے مشاعرے کی ابتدا کرنے اور ختم کرنے کا خیال بھی اکثر دلوں میں فرق ڈالتا ہے۔ لیکن اس مشاعرے میں میں نے انتہا کو ابتدا کر دیا ہے چنانچہ حضرت ظل سبحانی کے کلام معجز نظام سے مشاعرے کی ابتدا ہوگی اور اس کے بعد ہی میں اپنی غزل عرض کر کے ابتدا اور انتہا کے فرق کو مٹا دوں گا" یہ کہہ کر مرزا فخرو نے ہاتھ کا اشارہ کیا۔ دونوں چوبدار سامنے کھڑے تھے، دونوں شمعیں اٹھا کر ان کے سامنے لائے۔ انھوں نے بسم اللہ کہہ کر فانوس اتارے اور شمعیں جلا کر فانوس چڑھا دیئے۔ چوبدار لے شمعوں کو لے جا کر لگنوں میں رکھ دیا۔ اور سیدھے کھڑے ہو کر مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔ انھوں نے گردن سے اشارہ کیا۔ اشارہ پاتے ہی دونوں چوبداروں نے آواز بلند کہا
"حضرات! مشاعرہ شروع ہوتا ہے"
اس آواز کا سننا تھا کہ ایک سناٹا سا ہو گیا۔ قلعے والوں نے غزلیں تھیلوں میں بند کر کے تکیوں کے پیچھے رکھ دیں۔ نوکروں نے جھٹ پٹ حقے سامنے سے ہٹا دیئے اور ان کی جگہ سب کے سامنے اگالدان، خاصدان اور چین و حقے کی تشتریاں رکھ اپنی اپنی جگہ جا کھڑے ہوئے۔ اتنے میں بارگاہ جہاں پناہی کا خواصی بادشاہ سلامت کی غزل لیے ہوئے قلعے سے آیا۔ اس کے ساتھ کئی نقیب تھے وہ خود شمع کے قریب آکر تسلیمات بجا لایا۔ اور غزل پڑھنے کی اجازت چاہی مرزا فخرو نے گردن کے اشارہ سے اجازت دی۔ وہ وہیں بیٹھ گیا۔ نقیبوں نے آواز لگائی
"حاضرین! حضرت ظل سبحانی صاحبقران ثانی خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ کا کلام معجز نظام پڑھا جاتا ہے۔ نہایت ادب کے ساتھ گوش دل سے سماعت فرمائیے"

تکمیل

حضور شاہ میں اہل سخن کی آزمائش ہے ؎ چمن میں خوشنوایان چمن کی آزمائش ہے
نقیب کی آواز کے ساتھ ہی سب اہل محفل دوزانو ہو سنبھل کر بیٹھ گئے اور
پاس ادب سے سب نے گردنیں جھکا لیں۔ خواجہ نے بادشاہ سلامت کی غزل
خریطے میں سے نکالی، بوسہ دیا، آنکھوں سے لگایا اور بلند آواز سے سورٹھ کے سُروں
میں پڑھنا شروع کیا۔ الفاظ کی نشست، زبان کی خوبی، مضمون کی آمد اور سب سے
زیادہ پڑھنے والے کے گلے نے ایک سماں باندھ دیا۔ ایک کیفیت تھی کہ زمین سے
آسمان تک چھائی ہوئی تھی، کسی کو تعریف کرنے کا بھی ہوش نہ تھا، استادانِ فن
ہر شعر پر جھومتے تھے، کبھی کبھی کسی کے منہ سے سبحان اللہ، سبحان کے الفاظ
بہت نیچی آواز میں نکل گئے ورنہ ساری مجلس پر ایک عالم بے خودی طاری تھا۔
مقطع پر تو یہ حال ہوا۔ جیسے کسی نے سب پر جادو کر دیا۔ ہر شخص وجد میں جھوم
رہا تھا۔ باصرار تمام کئی کئی دفعہ مقطع پڑھوایا اور مضمون اور زبان کی چاشنی کا لطف
اٹھایا۔ لیجئے آپ بھی پڑھئے اور زبان کے مزے لیجئے۔

نہیں عشق میں اس کا تو رنج ہمیں کہ قرار و شکیب ذرا نہ رہا
غم عشق تو اپنا رفیق رہا کوئی اور بلا سے رہا نہ رہا

نہ تھی حال کی جب ہمیں اپنے خبر رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پہ جو نظر تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

ہمیں ساغر بادہ کے دینے میں اب کرے دیر جو ساقی تو ہائے غضب
کہ یہ عہد نشاط یہ دور طرب نہ رہے گا جہاں میں سدا نہ رہا

لگے یوں تو ہزاروں ہی تیر ستم، کہ تڑپتے رہے پڑے خاک میں ہم
وے ناز و کرشمہ کی تیغ دو دم، لگی ایسی کہ تسمہ لگا نہ رہا

ظفرؔ آدمی اس کو نہ جانیے گا، ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یاد خدا نہ رہی، جسے طیش میں خوف خدا نہ رہا

غزل پڑھ چکنے کے بعد خواصی نے کاغذ مرزا فخرو کے ہاتھ میں دیا۔ زرافشاں کاغذ پر خود حضرت ظل اللہ کے قلم کی لکھی ہوئی غزل تھی۔ خط ایسا پاکیزہ تھا کہ آنکھوں میں کھبا جاتا تھا۔ مرزا فخرو نے کاغذ نے کر ادھر ادھر دیکھا۔ مملوک العلی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا "صاحب عالم! ہمارا کیا منہ ہے جو ہم حضرت ظل سبحانی کی غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف کر سکیں۔ البتہ ان نوازشات شاہی کا شکریہ ادا کرتے ہیں جو حضرت پیر و مرشد نے غزل بھیج کر شرکائے مشاعرہ پر مبذول فرمائی ہیں۔ بارگاہ جہاں پناہی میں ہمارا ناچیز شکریہ پیش کر کے ہماری عزت افزائی کی جائے۔" مرزا فخرو نے خواصی کو روکا اور کہا "جانے سے پہلے صاحب عالم و عالمیان حضرت ولی عہد بہادر کی غزل بھی پڑھتے جاؤ۔ چلتے چلتے مجھے عنایت کی تھی اور فرمایا تھا کسی خوش گلو شخص سے پڑھوانا۔ بھلا تم سے زیادہ موزوں اور کون شخص مل سکتا ہے۔" یہ کہہ کر جیب میں ہاتھ ڈالا اور ایک کاغذ نکال کر خواصی کو دیا۔ اس نے آداب کر کے کاغذ لیا اور وہیں بیٹھ کر یہ غزل سنائی:

دل سے لطف و مہربانی اور ہے — مہربانی کی نشانی اور ہے
قصۂ فرہاد و مجنوں اور ہے — عشق کی میرے نشانی اور ہے
رو کئے سے کب مرے رکتے ہیں اشک — بلکہ ہوتی خوں فشانی اور ہے
ہم سے اے مرزا دہ کب بنتے ہیں صاف — ان کے دل میں بدگمانی اور ہے

غزل تو بہت پھبتی پھبتی تھی مگر ولی عہد بہادر کی غزل تھی بھلا کس کا جگرا تھا جو تعریف نہ کرتا۔ البتہ غالب اور مومن بالکل چپ بیٹھے رہے۔ بعض قلعے والوں کو برا بھی معلوم ہوا مگر ان دونوں کو خوب سمجھتے تھے کہ یہ سچی تعریف کرنے والے لوگ ہیں۔ ولی عہد تو ولی عہد اگر بادشاہ سلامت کی بھی کمزور غزل ہو تو گردن نہ ہلائیں۔ القصہ خدا ہی تو غزل پڑھ کر رخصت ہوا اور اب حاضرین جلسہ کے پڑھنے کی نوبت آئی۔

مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا۔ اس نے دونوں شمعیں لاکر ان کے سامنے رکھ دیں۔ صاحب عالم نے اپنی غزل نکالی اور ادھر ادھر نظر ڈال کر اور گردن کو ذرا جھکا کر کہا "بھلا میری کیا مجال ہے کہ آپ جیسے کاملین فن کے مقابلے میں کچھ پڑھنے کا دعویٰ کروں۔ البتہ جو کچھ ٹوٹا پھوٹا کہا ہے وہ بنظر اصلاح عرض کرتا ہوں۔"

۱ غم وہ کیا ہی جو جاں گزا نہ ہوا — درد وہ کیا جو لا دوا نہ ہوا

۲ حال کھل جائیں غیر کے سامنے — پر کروں کیا کہ تو برا نہ ہوا

۳ درد کیا جس میں کچھ نہ ہو تاثیر — بات کیا جس میں کچھ مزا نہ ہوا

۴ وہ تو ملتا ہے پر اے دل کم ظرف — تجھ کو ملنے کا حوصلہ نہ ہوا

۵ شکوۂ یار اور زبان رقیب — کہیں ٹھیرا کوئی گلا نہ ہوا

۶ تم رہو اور مجمع اغیار — میرا کیا ہے ہوا ہوا نہ ہوا

۷ پھر تمہارے ستم اٹھانے کو — دم مرا اچھا ہوا برا نہ ہوا

مرزا فخرو کی آواز تو اونچی نہ تھی مگر پڑھنے میں ایسا درد تھا کہ سن کر دل بے قابو ہو جاتا تھا۔ سارا مشاعرہ واہ واہ اور سبحان اللہ کے شور سے گونج رہا تھا۔ تیسرے شعر پر مرزا غالب نے اور پانچویں پر حکیم مومن خاں نے

ایسے جوش اسے واہ واہ کی کہ صف سے آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو اپنی غزل پڑھتے رہے مگر ان دونوں کو ان ہی دو شعروں کی رٹ لگی رہی۔ پڑھتے اور مزے میں آ کر جھومتے۔ جب غزل ختم ہوئی تو مرزا نوشہ نے کہا "سبحان اللہ صاحب عالم! سبحان اللہ! واہ کیا کہنا ہے، شعر یوں کہتے ہیں، مزا آگیا"۔ استاد ذوق بھی مسکرائے کہ چلو اسی بہانے سے میری تعریف ہو رہی ہے۔ مرزا فخرو نے جھک کر سلام کیا اور کہا "یہ آپ اصحاب کی بزرگانہ شفقت ہے جو اس طرح ارشاد ہوتا ہے۔ ورنہ من آنم کہ من دانم"۔ وہ جدھر نظر ڈالتے لوگ تعریفیں کرتے اور وہ جھک جھک کر سلام کرتے جاتے۔ جب محفل میں ذرا سکون ہوا تو مرزا فخرو نے چوبدار کو اشارہ کیا۔ اس نے شاہزادے کے سامنے سے ایک شمع اٹھا سامنے کی صف میں بیٹھے میاں پیل کے آگے رکھ دی۔ نام تو ان کا عبدالقادر تھا مگر شہر کا بچہ بچہ ان کو میاں پیل کہتا تھا۔ ان کو طاقت پر اتنا غرور تھا کہ کسی پہلوان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ جس اکھاڑے میں جاتے وہاں خم ٹھونک آتے اور کسی کی جرأت ہی ان کے سامنے خم ٹھونکنے کی ہمت نہ ہوتی۔ پہلوانی کی نسبت سے

پیلو ان کی فریدی نے آخر ان کو نیچا دکھا دیا۔ ان کا روز روز اکھاڑے میں خم ٹھونکنا لوگوں کو ناگوار گزرا۔ چوبی والوں سے کہا تو حاجی علی جان نے ایک پٹھا تیار کیا۔ بدن تھا تو بچہ سا لیکن داؤ پیچ میں طاق تھا اور پھرتی اس بلا کی تھی کہ کیا کہوں۔ ایک دن جو میاں پیل نے حسب معمول چوبی والوں کے ہاں آ کر خم ٹھونکے تو وہ ٹھڈا کپڑے اتار کر پینترا بدل سامنے آگیا اور خم ٹھونک کر ہاتھ ملانا چاہا۔ میاں پیل کو ہنسی آگئی کہ بھلا یہ پودنا میرا کیا مقابلہ کرے گا۔ ہاتھ ملانے میں تامل کیا۔ استاد علی جان نے کہا "کیوں بھئی ہاتھ کیوں نہیں ملاتے یا تو ہاتھ ملاؤ یا پھر کبھی اس اکھاڑے میں آ کر خم نہ ٹھونکنا"۔ کہنے لگے "استاد! جوڑ تو دیکھ لو۔ تو اب تم اس لونڈے کو پٹوانے سے حاصل؟" استاد نے کہا "میاں جو جیسی کرے گا ویسی بھرے گا۔ دنگل میں تم اسے کچل ڈالنا، یہی ہوگا نا کہ ہڈی پسلی (باقی بر صفحہ ۴۸)

تخلص بیل رکھتا تھا۔ مضمون بھی رندانہ باندھتے تھے۔ پڑھتے اس طرح تھے کہ گویا میدان کارزار میں رجز پڑھ رہے ہیں۔ اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی تعریف کرتا ہے یا نہیں کرتا۔ ان کو اپنے شعر پڑھنے سے کام تھا۔ غزل لکھی تھی۔

(صفحہ کے ام سے پیوستہ) اترو اگر آستانہ کان ہو جائیں گے"۔ دونوں ہاتھ مل گئے۔ تاریخ مقرر ہوگئی۔ اس مشاعرے کے دو چار ہی دن بعد شاہی جنگل میں کشتی قرار پائی۔ عیدگاہ کے پاس ہی جنگل ہے۔ دس پندرہ آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہے مگر اس روز وہاں تل رکھنے کو جگہ نہ تھی۔ جدھر نظر جاتی سر ہی سر دکھائی دیتے۔ میاں بیل کی بیہودگیوں کی وجہ سے ساری دہلی اس لونڈے کی طرف تھی۔ پہلے چھوٹی موٹی کشتیاں ہوتی رہیں۔ ٹھیک چار بجے یہ دونوں جانگیے پہن چادریں پھینک دنگل میں اتر پڑے۔ اترتے ہی دونوں نے "یا علی" کا نعرہ مارا۔ دو چار ڈھکیلیاں کھائیں۔ کچھ جھک کر مٹی سینے پر ڈالی اور خم ٹھونک آمنے سامنے آگئے۔ دونوں کے جسموں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ ہاتھی اور چیونٹی کا مقابلہ تھا۔ تمام دنگل میں سناٹا تھا۔ سوئی بھی گرے تو آواز سن لو۔ ہاں آواز تھی تو یا علی کی یا خم ٹھونکنے کی۔ میاں بیل نے لونڈے کا ہاتھ پکڑ جھٹکا دیا۔ وہ آگے کو جھکا۔ یہ کمر پر آگئے۔ وہ جھٹ غوطہ مار ہاتھوں کو چیر کر نکل گیا۔ انہوں نے اس کا سیدھا ہاتھ پکڑ دھوبی پاٹ پر کسنا چاہا۔ وہ زور کر کے الگ جا کھڑا ہوا۔ یہ گاؤ زوری کر کے اسے دبا تو لیتے لیکن وہ اپنی پھرتی کی وجہ سے ذرا سی دیر میں صاف نکل جاتا۔ آخر ایک دفعہ اس کو دبا ہی بیٹھے۔ وہ چپکا پڑا رہا۔ انہوں نے سینے کس لئے۔ تھوڑی دیر تک اس کو خوب رگڑا۔ وہ سہے چلا۔ انہوں نے پہلو میں آکس کر اس کا سینہ کھولنا چاہا۔ وہ بھی موقع تاک رہا تھا۔ یہ کھینچنے میں ذرا غافل ہوئے۔ اس نے ٹانگ پر بانہہ جو اڑایا تو میاں چاروں خانے چت جا پڑے۔ لونڈا اچک سینے پر سوار ہوگیا۔ "وہ مارا، وہ مارا" کی آوازوں سے دنگل ہل گیا۔ لوگوں نے دوڑ کر لونڈے کو گود میں اٹھا لیا۔ کسی نے یہ بھی پھر کر نہ دیکھا کہ میاں بیل کہاں پڑے ہیں۔ یہ بھی چپکے سے اٹھ چادر اوڑھ منہ لپیٹ ایسے غائب ہوئے کہ پھر کسی نے ان کی صورت نہ دیکھی۔ دنگل سے لپا گئے۔ ہمیشہ کے لئے دہلی سے گئے۔ تخت بڑے پیر سنہ دو دن اور آج کا دن پھر ان کی صورت نہ نظر آئی۔ خدا جانے کہاں مر کھپ گئے۔

کہہ دو رقیب سے کہ وہ باز آئے جنگ سے — ہرگز نہیں ہیں یار کبھی کم اس ڈھنگ سے

لب کا بڑھا دیا ہے مزا خط سبز نے — ساقی نے پشت دی مئے صافی کو بنگ سے

دل اب نکلے بے طرح سے پھنسا زلف یار میں — نکلے یہ کیوں کہ دیکھئے قید فرنگ سے

آجائیو نہ پیچ میں ظالم کے دیکھنا — یاری تو چھٹنے کی ہے دل اس شوخ شنگ سے

ان کی غزل ختم ہوتے ہی چوبدار نے دوسری شمع اٹھا مرزا علی بیگ کے سامنے رکھدی یہ بڑے گورے چٹے نوجوان آدمی ہیں کسرت کا بھی شوق ہے نازنین تخلص کرتے ہیں۔ دہلی میں بس یہی ایک ریختی گو ہیں۔ ادھر شمع رکھی گئی ادھر نواب زین العابدین خاں نے آواز دی "اوڑھنی لاؤ" ایک نوکر فوراً تاروں بھری گہرے سرخ رنگ کی اوڑھنی لے کر حاضر ہوا نازنین نے بڑے ناز و انداز سے اس کو اوڑھا ایک پلو کا گھونگھٹ مارا دوسرا پلو سامنے پھیلا لیا۔ اور خاصی بھلی چنگی عورت معلوم ہونے لگے۔ غزل ایسی اٹھا اٹھا کر پڑھی کہ سارا مشاعرہ عش عش کرنے لگا۔ نزاکت ایسا پیارا اکڑتے تھے کہ کوئی بیسوا بھی کیا کرے گی۔ دوسرا شعر تو اس طرح پڑھا کہ گویا "باجی" کو جلانے کے لئے سب شکر کرنے کو تیار ہیں قلعے والوں کو تو اس غزل میں بڑا مزہ آیا مگر جو ریختے کے استاد تھے وہ خاموش بیٹھے سنتے رہے۔ غزل یہ تھی۔

ہوئی عشاق میں مشہور یوسف سا اچکا کا — ہوا ہم عورتوں میں تھا بڑا دیدہ زلیخا کا

تجھے کہتی ہیں باجی تو نے ناکا چھیڑ دیور کو — نہیں ڈرنے کی ہیں ہاں نہیں ناکا تو اب ناکا

اگر اے نازنیں تو دلی بیٹی ہنستی سی ہے — چھریرہ سا بدن نام خدا ہے تیرے وطرا کا

اب دونوں شمعیں اس طرح گردش کرنے لگیں کہ پہلے صف کے سیدھی جانب کا ایک سے شخص غزل پڑھتا تھا اور پھر دوسری طرف کے بائیں جانب کا شخص۔ یہ ایک نقشہ دیتا ہوں اس سے نشست کی کیفیت پڑھنے والوں کو سمجھ اور مشاعرہ کا انتظام اچھی طرح سمجھ میں آجائے گا۔

ناز تین کے پڑھنے کے بعد دائیں جانب کی شمع ہٹا کر میاں عاشق کے سامنے آئی۔ یہ بیچارے ایک مزدور پیشہ آدمی ہیں لکھنا پڑھنا بالکل نہیں جانتے نہ کسی کے شاگرد ہیں نہ کسی کے استاد شعر خاصہ کہتے ہیں۔ اس مشاعرے میں ایک شعر تو ایسا لکھ گیا ہے کہ سبحان اللہ لکھا ہے۔

نقد تو ہی نہ میرا لے بت خونخوار دشمن ہے — ترے کیسے میں اپنا سر در و دیوار دشمن ہے

غزل میں باقی سارے اشعار تو صرف بھرتی کے تھے مگر اس شعر پر ہر طرف سے بڑی دیر تک واہ واہ ہوتی رہی۔ ان کی غزل ختم کرنے پر بائیں طرف کی شمع اٹھا کر عبداللہ خاں اوج کے سامنے رکھدی گئی۔ یہ بڑے پرانے ۴۰ ۵۰ برس کے مشاق شاعر ہیں مضمون کی تلاش میں ہر وقت سرگرداں رہتے ہیں لیکن ڈھونڈ ڈھانڈ کر ایسے بلند مضامین اور نازک خیالات لاتے ہیں کہ ایک شعر تو کیا ایک قطعے میں بھی ان کی سمائی مشکل ہے اور کوشش کرتے ہیں کہ ایک شعر میں مضمون کو کھپا دیں نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے بھلا دوسروں کو تو ان کے شعروں میں کیا مزا آئے اور کوئی کیا داد دے۔ ہاں یہ خود ہی پڑھتے ہیں خود ہی مزے لیتے ہیں اور خود ہی اپنی تعریف کر لیتے ہیں۔ غزل اس زور و شور سے پڑھتے ہیں کہ زور میں آ کر صف مجلس سے گزوں آگے نکل جاتے ہیں۔ ان کے شاگرد دو چار ہی ہیں مگر استاد بھی ان کو استاد مانتے ہیں۔ بھلا کس کا بل بوتہ ہے جو ان کو استاد نہ کہہ کر مفت کی لڑائی مول لے۔ ادھر انہوں نے شعر پڑھا استاد ذوق یا مرزا غالب نے داد دی۔ داد دینے میں ذرا دیر ہوئی۔ اور ان کے تیور بدلنے لگے غصے کی بھلا کون تاب لا سکتا ہے۔ چار و ناچار تعریف کرنی پڑتی ہے۔ جب کہیں جا کر یہ

---

۵ دلی میں شیر جنگ جہان بیگ نامی طوائف تھی وہ حج کرنے روانہ ہوئی۔ اس پر اوج فرماتے ہیں۔

بجا ہے شیر پہ اگر چھوڑ دلی حج کو چلی — مثل مشہور ہے نو سو چوہے کھا کے بلی حج کو چلی

(باقی بر صفحہ ۵۲)

ٹھنڈے پڑتے۔ غزل ہوئی تھی۔

دم کا جو دمدمہ یہ باندھے خیال اپنا　　ہے پل صراط اتریں یہ ہی کمال اپنا

طفلی ہی سے ہے مجھکو وحشت سرائے نفرت　　سم میں گڑا ہوا ہے آہو کے نال اپنا

کسب شہادت اپنا ہی یاد کس کو قاتل　　سانچے میں تیغ کے سر لیتے ہیں ڈھال اپنا

چیچک کے آبلوں کی ہیں باگ توڑ رہا ہوں　　رکھ کے دیوی کے آستاں پہ سیس ملا اپنا

آخری شعر پر مرزا غالب اچھل پڑے۔ کہنے لگے "واہ میاں اوج اس شعر کے دوسرے مصرعے نے تو غضب ہی ڈھایا ہے۔ بھئی واللہ الفاظ "رکھ کے" کیا خوب پھنسائے ہیں۔ یہ سب کا فریب جو تمہیں استاد کہتے ہیں۔ میاں تم تو شعر کے خدا ہو خدا"۔ غرض سب استادوں نے تعریفوں کے پل باندھ دیئے اور میاں اوج ہیں کہ پھول کر کپا ہوئے جاتے ہیں۔ جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی طرف شمع کھسک کر محمد یوسف تمکین کے سامنے آئی۔ ان کی عمر کوئی ۱۵، ۲۴ سال کی ہوگی۔ مدرسہ دہلی کے طالب علم ہیں۔ غضب کی ظریفانہ طبیعت پائی ہے۔ بات کرتے ہیں منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ نازک نازک نقشہ سانولا رنگ بھرے بھرے ہاتھ پاؤں جوان ہوں گے تو بڑے خوبصورت آدمی نکلیں گے۔ غزل کہی تھی۔

دوزخ بھی جس سے مانگتا ہر دم پناہ تھا　　کس دل جلے کی بار خدایا یہ آہ تھی

(صفحہ ۵۱ سے پیوستہ) (۲) حکیم مومن خان مومن کو کنور اجیت سنگھ نے ایک ہتھنی سواری کے لئے نذرانہ میں پیش کی۔ اوج کو خبر لگی کہتے ہیں:

جہنموں میں وہ مومن مکان لیتا ہے　　بجوگی بن کے جو ہتھنی کا دان لیتا ہیں

خانہ خراب ہو جو ترا عشق بے حیا ق آئین کونسا تھا یہ کیا رسم و راہ تھی

تو نے جو دل کو میرے صنم خانہ کر دیا رہتا خدا تھا جس میں یہ وہ بارگاہ تھی

تمکین کو اک نگاہ میں دیوانہ کر دیا جادو فریب آہ یہ کس کی نگاہ تھی

میاں تمکین کا دل بڑھانے کو سب نے تعریف کی۔ قطعہ کو کئی دفعہ پڑھوایا۔ استاد احسان نے کہا "میاں یوسف! کیا کہنا ہے۔ خوب کہتے ہو۔ کوشش کئے جاؤ ایک نہ ایک دن استاد ہو جاؤ گے۔ مگر میاں کسی کے شاگرد ہو جاؤ۔ بے استاد رہے تو بھٹک جاؤ گے۔" میاں تمکین نے مسکرا کر کہا "استاد! میں کہیں آپ کے حکم سے باہر ہو سکتا ہوں۔ کل ہی انشاء اللہ استاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔" استاد ذوق نے کہا "ہاں بھئی ہاں! خوب انتخاب کیا۔ بس یہ سمجھو کہ چند ہی دن میں بیڑا پار ہے۔" میاں یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ دوسری شمع غلام احمد تصویر کے سامنے پہنچ گئی۔ ان کو میاں بھن بھی کہتے ہیں۔ الف کے نام بے نہیں جانتے مگر طبیعت غضب کی پائی ہے۔ پہلے میاں تنویر کے شاگرد تھے۔ بعد میں ان سے ٹوٹ کر استاد ذوق سے آ ملے۔ بھاری بدن، منڈھی ہوئی ڈاڑھی، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، گدرایا ہوا رنگ، جسم پر سوسی کا تنگ مہری کا پاجامہ، اوپر سوسی کا کرتہ، گلے میں لٹکا ہوا رومال، سر پر موزنی کے کام کی گول ٹوپی۔ بچارے نیچہ بندی پر گزارہ کرتے ہیں۔ [illegible] ہیں۔ لکھنا پڑھنا تو جانتے ہی نہیں اس لئے جو کچھ کہتے دل و دماغ ہی میں گھونٹتے جاتے ہیں۔ یاد اس بلا کی ہے کہ ذرا چھیڑ دو تو ارگن کی طرح بجنے لگتے ہیں اور ختم کرنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ کلام ایسا پاکیزہ ہے کہ بڑے بڑے استادوں کے سر ہل جاتے ہیں۔ ان کو سنو تو یہ معلوم ہی نہیں ہوتا کہ ایک ان پڑھ آدمی بول رہا ہے۔ بس یہی سمجھ لو کہ "الشعراء تلامیذ الرحمٰن" کی بہترین

دلی لگاؤ ہے اگر کوئی مشاعرہ نہیں ہوتا جہاں یہ نہ پہنچتے ہوں۔ غزل میں دو شعر بہت اچھے تھے وہی لکھتا ہوں۔

کبھی بن بادہ رہ نہیں سکتے ۔۔۔ تو یہ کچھ ہم گناہگار نہیں
دل میں خوش ہیں عدو برائے تابش ۔۔۔ وہ ستمگر کسی کا یار نہیں

مقطع کی کچھ ایسی پیاری بندش پڑی ہے کہ سب کے منہ سے بے ساختہ واہ واہ نکلی مفتی صدرالدین صاحب کی تو یہ حالت تھی کہ پڑھتے تھے اور جھومتے تھے۔
تابش کے بعد الٹی جانب کی شمع میاں قلق کے آگے گئی۔ خدا ان کو محفوظ رکھے بڑے چالاک آدمی ہیں عبدالعلی نام ہے مدراس کے رہنے والے ہیں۔ کوئی ۳۰ برس کی عمر ہے۔ بچپن ہی میں گھر سے نکل کھڑے ہوئے حیدرآباد ہوتے ہوئے دہلی آئے ہزاروں کو تعویذوں کے جال میں پھنسا کر پیر اکر دیا۔ ان کی شکل سے لوگ گھبراتے نہیں۔ شاہ صاحب بنے پھرتے ہیں مگر دل کا خدا مالک ہے۔ شعر خاصا کہتے ہیں۔ لکھا تھا:

خم شراب سے خم کر دوں تو بن گیا ۔۔۔ ساقی بنا دے ٹھا پیالا اچھال کے
ہم شہر میں چلیں گے قلق تو کشی کرو ۔۔۔ جھگڑے وہاں نہیں ہیں حرام و حلال کے

یہ پڑھ چکے تو شمع منشی محمود جان اوج کے سامنے گئی۔ ان کی غزل میں دو شعر ایسے تھے جن کی تھوڑی بہت تعریف ہوئی باقی تو سب بھرتی کے تھے۔

آنے میں اس جہان میں کیا دیر ہے ۔۔۔ کچھ مقدر کا ہمارے پھیر ہے

؎ اشارہ یہ ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں کہ سیدھی طرف کی شمع بڑھی یا الٹی جانب سے لہذا یہ سمجھ لیجئے کہ پہلے دائیں طرف کا ایک شاعر پڑھتا تھا اور پھر بائیں طرف کا۔

ہے یقیں وہ جانِ جاں آتا نہیں — موت کے آنے میں پھر کیوں دیر ہے

ان کے بعد مرزا کامل بیگ کی باری آئی۔ یہ سپاہی پیشہ آدمی ہیں۔ کامل تخلص کرتے ہیں۔ مشاعرے میں بھی اردلی بن کے آئے ہیں۔ غزل اس طرح پڑھی گویا فوج کی کمان کر رہے ہیں۔ دیکھ لو مضمون میں بھی وہی سپاہیانہ رنگ کی جھلک ہے۔ ان کی غزل میں قطعہ بڑے مزے کا تھا وہی لکھتا ہوں:-

شرمائے آپ تجھ دل ابرو کرے ہیں ٹکڑے — یہ بات ہے ٹھیک جب اس سے ادا ہی
کہنے لگا کہ ترکش جس وقت ہووے خالی — تلوار پھر نہ کھینچے تو کیا کرے سپاہی

اب حکیم سید محمد متعشق کے پڑھنے کا نمبر آیا۔ یہ بڑے پایہ کے ادیب ہیں ۶۳، ۶۴ برس کی عمر ہے۔ حکمت میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ غرض کیا کہوں ایک جامع کمالات شخص ہیں مگر اپنے آپ کو بہت دور کھینچتے ہیں۔ اچھا شعر سنتے ہیں تو بے تاب ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس طرح میں تعریف کرتا ہوں اسی طرح دوسرے بھی میرے شعر کی تعریف کریں۔ شعر برا نہیں کہتے مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ شاذ و نادر جھک آ گئے اور ہر شخص کے منہ سے بے ساختہ واہ واہ نکل جائے۔ اب خود ہی ان کا کلام دیکھ لیجئے:

تجھ کو اس میری آہ زاری پر — رحم اے فتنہ گر نہیں آتا
وعدۂ شام تو کیا لیکن — کچھ وہ آتا نظر نہیں آتا
تیرے بیمار کا ہے یہ عالم — ہوش دو دو پہر نہیں آتا

تعریف تو ہوئی مگر کچھ ان کے دل کو نہ لگی۔ اس لئے ذرا آزردہ سے ہو گئے۔
ان کے بعد شمع میر حسین تجلی کے سامنے آئی۔ یہ میر تقی میر کے پوتے ہیں بڑے ظریف اور نکتہ سنج آدمی ہیں۔ کلام میں وہی میر صاحب کا رنگ جھلکتا ہے

زبان پر جان دیتے ہیں۔ غزل تو چھوٹی سی ہوتی ہے مگر جو کچھ کہتے ہیں اچھا کہتے ہیں
کیوں نہ ہو آخر کس کے پوتے ہیں۔

مری قضا پہ تجھے روز رشک تھا اے ظالم
پھر یہ تیغ ہی لے اب تو اعتبار آیا

یہ شوق دیکھو پس مرگ بھی تجلی نے
کفن میں کھول دیں آنکھیں سنا جو یار آیا

دوسرے شعر پر وہ وہ تعریف ہوئی کہ میاں تجلی کی باچھیں کھل گئیں۔ میاں تجلی پڑھ چکے تو حکیم سکھا نند رقم کی باری آئی۔ ان کو میں حکیم مومن خاں صاحب کے مکان پہ دیکھ چکا تھا۔ کلام تو ایسا اچھا نہیں ہوتا مگر پڑھتے خوب ہیں۔ جہاں کسی نے زرا بھی تعریف کی اور انھوں نے سلام کا تار باندھ دیا۔ غزل لکھی تھی۔

بجھاتا آتش دل کا بھی کچھ حقیقت ہے
زرا سا کام ہے تجھے چشم تر نہیں آتا

عدم سے کوچۂ قاتل کی راہ ملحق ہے
گیا ادھر جو گزر پھر ادھر نہیں آتا

ہو حال کے چارہ گری اس مریض کی تیری
نظر میں تجھ سا کوئی چارہ گر نہیں آتا

تیسرا شعر حکیم مومن خاں صاحب کے رنگ کا تھا۔ اس کی انھوں نے بہت تعریف کی۔ مگر اس کے ساتھ یہ بھی کہا "میاں رقم یا تو تم حکمت ہی کرو یا شعر ہی کہو۔ ان دونوں چیزوں کا ملا کر چلانا زرا مشکل کام ہے۔"

شمع کا پہنچنا تھا مرزا احمد جوش کے سامنے جانا تھا کہ شاگردان ذوق زرا سنبھل بیٹھے۔ جوش کو استاد ذوق بہت عزیز رکھتے ہیں۔ ان کی عمر تو ۱۸، ۱۹ سال کی ہے مگر بلا کے طباع اور ذہین ہیں۔ ان کی سخن گوئی اور سخن فہمی کی قلعے بھر میں دھوم ہے مگر مشاعرے میں انہوں نے جو غزل پڑھی وہ تو مجھے کچھ پسند نہ آئی۔ ہاں قلعے والوں نے واہ واہ کے شور سے مکان سر پر اٹھا لیا۔ استاد

ذوق نے بھی سبحان اللہ سبحان اللہ کہہ کہہ کر شاگرد کا دل بڑھایا۔ غزل دیکھ لیجئے ممکن ہے کہ میں نے ہی غلط اندازہ لگایا ہو۔

کیوں کر وہ ہاتھ آئے کہ یاں زر و زر نہیں ۔۔۔ لے دے کے ہے اک آہ سو اس میں اثر نہیں

قسمت کہ درد بھی تو ہوا وہ نہیں نصیب ۔۔۔ جس درد کا کہ چارہ نہیں چارہ گر نہیں

قسمت ہی ہو نہیں ہے تو شہادت دگر نہ یاں ۔۔۔ وہ زخم کون سا ہے کہ جو کارگر نہیں

سجدے میں کیوں پڑا ہے ارے اٹھ شراب پی ۔۔۔ اے جوش میکدہ ہے خدا کا یہ گھر نہیں

آپ نے غزل ملاحظہ کر لی۔ میں تو اب بھی یہی کہوں گا کہ کوئی شعر بھی ایسا نہیں جو تعریف کے قابل ہو۔ اب زبردستی کی تعریف کرنا دوسری بات ہے۔

ان کے بعد مولوی امام بخش صہبائی کے بڑے فرزند محمد عبد العزیز کا نمبر آیا۔ یہ عزیز تخلص کرتے ہیں۔ غزل خوب کہتے ہیں۔ کیوں نہ ہو بڑے باپ کے بیٹے ہیں۔ ہائے کیا کیا شعر نکالے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

جوں شمع شغل تیرے سراپا نیاز کا ۔۔۔ جلنا جو سوز کا ہے تو رونا گداز کا

کج فہمیوں سے خلق کی دیکھا کہ کیا ہوا ۔۔۔ منصور کو حریف نہ ہونا تھا راز کا

ہم عاصیوں کا بار گنہ سے جھکا ہے سر ۔۔۔ اور خلق کو گمان ہے ہم پر نماز کا

مغرور یہ تھا ہی اور وہ مغرور ہو گیا ۔۔۔ اس میں گلہ نہیں مجھے آئینہ ساز کا

اوروں کے ساتھ لطف تھا صورت نیاز ۔۔۔ یاں بڑھ گیا دماغ تغافل سے ناز کا

ذرا سچ کہیے گا، ساری کی ساری غزل مرصع ہے یا نہیں۔ ہاں اس غزل کی جو کچھ تعریف ہوئی وہ بجا ہوئی۔ استاد ذوق نے بھی کہا۔ اہا ہا

صہبائی تمہارا یہ لڑکا غضب کا نکلا ہے۔ خدا اس کی عمر میں برکت دے۔ ایک دن بڑا نام پیدا کرے گا۔ واہ میاں صاحبزادے واہ! کیا کہنا ہے! دل خوش ہو گیا۔ کیوں نہ ہو ایسوں کے ایسے ہی ہوتے ہیں۔" میاں عزیز نے اٹھ کر سلام کیا۔ اور بیٹھ گئے۔ میاں عزیز کے بعد شمع خواجہ معین الدین یکتا کے سامنے آئی۔ ان کا کیا کہنا۔ سرکار سے خطاب خانی پایا ہے۔ کسی کو خاطر میں ہی نہیں لاتے۔ کبھی کسی کے شاگرد ہوتے ہیں کبھی کسی کے۔ پہلے احسان سے تلمذ تھا۔ آج کل مرزا غالب کی طرف ڈھلک گئے ہیں۔ ایسے متلون مزاجوں کو نہ کبھی کچھ کہنا آیا ہے نہ آئے گا۔ میرا تو دل خوش ہوا کہ کسی نے تعریف نہیں کی۔ بڑے جلے ہوں گے۔ بھلا ایسے شعروں کی کوئی خاک تعریف کرتا۔

لے آؤ شعلہ زا یہ خس و خار بھی نہیں | تو آسماں ہیں وہ بھی نہیں چار بھی نہیں

ہے کس کو تاب شکوۂ دشمن کہ ضعف سے | لب پہ ہمارے تذکرۂ یار بھی نہیں

جینا فراق یار میں وعدے کی لاگ پر | آساں گر نہیں ہے تو دشوار بھی نہیں

ہاں اب جس کے سامنے شمع آئی ہے وہ شاعر ہے۔ یہ کون ہیں مرزا حاجی بیگ شہرت۔ گورا رنگ، میانہ قد، کوئی ۳۰، ۳۲ برس کی عمر، بڑے بنے سنورے رہتے ہیں۔ پہلے ان ہی کے مکان پر مشاعرہ ہوتا تھا۔ اب تھوڑے دنوں سے بند ہے۔ مفتی صدر الدین صاحب کے شاگرد رشید ہیں۔ کہتے بھی خوب ہیں اور پڑھتے بھی خوب ہیں۔ بڑی پاٹ دار آواز ہے۔ پڑھنے کا ڈھنگ ایسا ہے کہ ایک ایک لفظ دل میں اتر جاتا ہے۔ ہر شعر پر تعریفیں ہوتیں اور کیوں نہ ہوتیں، ہر شعر تعریف کے قابل تھا۔ غزل یہ ہے۔

ایک دن دو دن کہاں تک تو بھی کچھ انصاف کر　　　یہ تو چلنا روز کا لے سوز ہجراں ہو گیا

ہے ترقی جوہر قابل ہی کے شایاں کہیں　　　خاک کا پتلا بنا پتلے سے انساں بن گیا

کفر و دیں میں تھا نہ کچھ عقدہ بجز بند نقاب　　　اس کے کھلتے ہی یہ کار مشکل آساں ہو گیا

پہلے دعوائے خدائی اس بت کافر کو تھا　　　کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں بن گیا

آخری شعر پر تو مرزا غالب کی یہ حالت تھی کہ گویا بالکل مست ہو گئے ہیں، رانوں پر ہاتھ مارتے اور کہتے "واہ میاں شہرت واہ! کمال کر دیا۔ شعر کیا ہے اعجاز ہے، ہر ایک شعر بڑے بڑے دیوانوں پر بھاری ہے۔ ہاں کیا کہا ہے۔ سبحان اللہ!

پہلے دعوائے خدائی اس بت کافر کو تھا　　　کچھ درستی پر جو آج آیا تو انساں ہو گیا

غرض اس شعر نے ایک عجیب کیفیت محفل میں پیدا کر دی تھی، لوگ خود بخود ایک دوسرے کو سناتے تھے مزے لے لے کر پڑھتے تھے اور جوش میں واہ واہ اور سبحان اللہ کے نعرے مارتے۔ تھوڑی دیر میں جا کر محفل میں ذرا سکوت ہوا تو شمع نواب شمس حسین خاں تنویر کے سامنے آگئی۔ یہ نوجوان آدمی ہیں کوئی ۳۲، ۳۳ برس کے ہوں گے بادشاہ سلامت ان کو بہت عزیز رکھتے ہیں، میاں شہرت کے شعر نے وہ جوش پیدا کر دیا تھا کہ ان کی غزل کسی نے بھی غور سے نہیں سنی۔ غزل بھی معمولی قافیہ ردیف پر تھی، یہ قطعہ خاصا تھا۔

جوانی کر دل میں سمجھے اپنا نقش پیرہن　　　کہا لوگوں نے لباس مجنوں غبار ہی کیا

رنگ اس کا رخ زرد [illegible] چشم [illegible]　　　پوچھا اس کا اس شخص کو آزار ہی کیا

یہ پڑھ چکے تو شمع میر بہادر علی حزیں کے سامنے رکھی گئی۔ یہ بڑے سنجیدہ [illegible]

اور وضع دار آدمی ہیں۔ عارفؔ کے شاگرد ہیں۔ ان کا ایک شعر بڑے مزے کا ہے:

سبو سے منھ لگا دیں گے، اب اتنا صبر کس کو ہے
کہ بھرتے خم سے مے شیشے میں اور شیشے سے ساغر میں

جو غزل انھوں نے اس مشاعرے میں پڑھی تھی اس کے دو تین شعر اچھے تھے۔

دنیا کی وسعتیں ترے گوشے میں آگئیں
اللہ رے وسعتیں تری اے تنگنائے دل

جل جل کے آخرش تپشِ غم کے ہاتھ سے
اک داغ رہ گیا ہے پہلو میں جائے دل

دیکھا وہ اپنی آنکھ سے جو کچھ سنا نہ تھا
اور دیکھیے حزیںؔ ابھی کیا کیا دکھائے دل

مقطع کو سب نے پسند کیا اور واقعی ہے بھی اچھا۔

ان کے بعد شمع ایسے شخص کے سامنے آئی جو خود شاعر، جس کا باپ شاعر، جس کا بھائی شاعر، جس کا سارا خاندان شاعر۔ وہ کون؟ میاں باقر علی جعفریؔ فخر الشعرا نظام الدین ممنونؔ کے چھوٹے بھائی، ملک الشعرا قمر الدین منتؔ کے چھوٹے بیٹے۔ ان کی غزل میں زور نہ ہوگا تو اور کس کی غزل میں ہوگا۔ دو شعر لکھے ہیں:

تیغ یوں دل میں خیالِ نگہِ یار نہ کھینچ
ناخدا ترس تو کیجے یہاں تو تلوار نہ کھینچ

پے سیر چمن دشت میں گھبرا کے نہ پھر
نازِ ہر گل نہ اٹھا منتِ ہر خار نہ کھینچ

غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف نہیں ہوئی۔ وجہ یہ ہے کہ یہ رنگ اب دلی سے اٹھتا جاتا ہے۔ اب تو روزمرہ پر جان دیتے ہیں۔ اس میں اگر مضمون پیدا ہو گیا تو سبحان اللہ۔ مرزا غالبؔ اس رنگ کے بڑے دلدادہ تھے، وہ بھی اس کو اب چھوڑتے جاتے ہیں۔

اس کے بعد منشی محمد علی تشنہؔ کے پڑھنے کی باری تھی۔ چوبدار ان کے سامنے

شمع رکھنے میں ذرا ہچکچایا، اور یہ ننگ دھڑنگ مزے میں دو زانو بیٹھے جھوم رہے تھے۔
چوبدار نے مرزا فخرو کی طرف دیکھا۔ انھوں نے آنکھ سے اشارہ کیا کہ رکھ دے۔
اس نے شمع رکھ دی۔ جب شمع کی روشنی آنکھوں پر پڑی تو تشنہ نے بھی آنکھیں
کھولیں۔ کچھ سمجھ کر پھونک مار شمع گل کر دی اور کہا "میں بھی کچھ عرض کر دوں؟" سب نے
کہا "ضرور فرمائیے۔" انھوں نے نہایت آزادانہ لہجے میں کچھ گاتے، کچھ پڑھتے
ہوئے یہ غزل سنائی۔

آنکھ پڑتی ہے کہیں پاؤں کہیں پڑتا ہے — سب کی ہے تم کو خبر اپنی خبر کچھ بھی نہیں
شمع ہے گل بھی ہے بلبل بھی ہے پروانہ بھی — رات کی رات یہ سب کچھ ہے سحر کچھ بھی نہیں
حشر کی دھوم ہے سب کہتے ہیں یوں ہے یوں ہے — فتنہ ہے اک تری ٹھوکر کا مگر کچھ بھی نہیں
نیستی کی ہے مجھے کوچۂ ہستی میں تلاش — سیر کرتا ہوں ادھر کی کہ جدھر کچھ بھی نہیں
ایک آنسو بھی اثر جب نہ کرے اے تشنہ — فائدہ رونے سے اے دیدۂ تر کچھ بھی نہیں

میں کیا بتاؤں کہ اس غزل کا کیا اثر ہوا۔ ایک سناٹا تھا کہ زمین سے آسمان تک
چھایا ہوا تھا۔ غزل کا مضمون، آدھی رات کی کیفیت، پڑھنے والے کی حالت؛ غرض
یہ معلوم ہوتا تھا کہ ساری محفل کو سانپ سونگھ گیا ہے۔ ادھر یہ عالم طاری تھا، ادھر
میاں تشنہ ہاتھ جھٹکتے ہوئے چل دیے اور "کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں" کی آواز
بڑی دیر تک کانوں میں گونجتی رہی۔ جب طبیعتیں سنبھلیں تو سب کے
منھ سے بے اختیار یہی نکلا کہ "واقعی کچھ بھی نہیں۔"

مرزا فخرو نے شمع منگا کر روشن کی اور کہا "ہاں صاحب پھر شروع کیجیے۔"
شمع حافظ محمد حسین بسمل کے سامنے رکھی گئی۔ بھلا تشنہ کے بعد ان کا کیا رنگ

جمتا۔ اوّل تو یہ نومشق ہیں، مرزا قادر بخش صابر سے اصلاح لیتے ہیں دوسرے
غزل میں بھی کوئی خاص بات نہ تھی، البتہ مقطع اچھا تھا۔ غزل ملاحظہ ہو۔

دل تو نے ہم سے اوبت کافر اٹھا لیا — اس نازکی پہ پوچھ یہ کیوں کر اٹھا لیا
بارِ گرانِ عشق فلک سے نہ اٹھ سکا — کیا جانے میرے دل نے یہ کیونکر اٹھا لیا
پیرِ مغاں نے بسملِ میکش کو دیکھ کر — شیشہ بغل میں ہاتھ میں ساغر اٹھا لیا

بہرحال کسی نے سنا کسی نے نہیں سنا، کچھ تھوڑی بہت تعریف بھی ہوئی اور
شمع میر حسین تسکین کے پاس پہنچ گئی۔ ان کی کوئی ۴۰ برس کی عمر ہو گی۔
شاہ نصیر کے شاگرد ہیں مومن سے بھی اصلاح لی ہے۔ ان کا خاندان دہلی میں
بہت مشہور رہا ہے، انہی کے دادا میر حیدر نے میر حسین علی وزیر فرخ سیر کو مارا
تھا۔ سپاہی پیشہ آدمی ہیں شعر برا نہیں کہتے۔ لکھا تھا:

ہزار طرح سے کرنی پڑی تسلی دل — کسی کے جانے سے گو ہنوز نہیں قرار مجھے
شبِ وصال میں سننا پڑا فسانۂ غیر — سمجھتے کاش وہ اپنا نہ رازدار مجھے
وہ اپنے وعدے پہ تحفہ میں جلوہ فرما ہیں — نہیں ہے ضعف سے اب تو وہیں گزار مجھے
مرے قصور سے دیدار میں ہوئی تاخیر — نہ دیکھنا تھا تماشائے روزگار مجھے
مزے یہ دیکھے ہیں آغازِ عشق میں تسکین — کہ سوجھتا نہیں اپنا مآلِ کار مجھے

غرض اسی غزل نے مشاعرہ کا رنگ پھر درست کر دیا اور لوگ ذرا سنبھل بیٹھے
استاد احسان کے شاگرد خواجہ غلام حسین بیدل کے سامنے شمع آئی
انھوں نے یہ غزل سنائی۔

تجھ کی چشم کی زلفِ دوتا کی — ہے اک دل جفا کس کس بلا کی

کب اس گل کی گلی تک جا سکے ہے — ہوا باندھی ہی یاروں نے ہوا کی

بتوں سے ملتے ہو راتوں کو مبتلا — تمہیں بھی دن لگے قدرت خدا کی

ساری کی ساری غزل جیسی تھی، بھلا اس کی کون تعریف کرتا۔ ہاں اس کے بعد جو غزل محمد حسین صاحب تائب نے پڑھی اس میں مزا آ گیا۔ میاں تائب مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کے بھتیجے ہیں۔ اور فخر الشعرا نظام الدین ممنون کے شاگرد۔ چھوٹی بحروں میں ایسی غزل لکھتے ہیں کہ سبحان اللہ اور پڑھنا تو ایسا ہے کہ تعریف نہیں ہو سکتی۔ غزل تھی۔

پھر کماں وار جگر چاک ہوا — پھر کوئی ماہ لقا یاد آیا

کہیے اس بت کو شکیبا کیسے — دیکھ کر جس کو خدا یاد آیا

عہد پیری میں جوانی کی امنگ — آہ کس وقت میں کیا یاد آیا

دوسرے اور تیسرے شعر پر تو یہ حال تھا کہ لوگ تعریفیں کرتے کرتے اور میاں تائب سلام کرتے کرتے تھکے جاتے تھے جب ذرا جوش کم ہوا تو شمع استاد ذوق کے استاد غلام رسول شوق کے سامنے آئی۔ بیچارے بڈھے آدمی ہیں۔ شاہ نصیر کے شاگرد ہیں۔ مسجد عزیز آبادی میں امامت کرتے ہیں۔ شروع میں استاد ذوق نے ان کو اپنا کلام دکھایا تھا۔ اسی بوتے پر یہ اپنے آپ کو ان کا استاد کہا کرتے ہیں اور اب بھی چاہتے ہیں کہ ذوق اسی طرح آ کر مجھ سے اصلاح لیا کریں مگر وہ کچھ کھنچے کھنچے سے معلوم ہوتے ہیں۔ غزل جو پڑھی تو واقعی اس کا مطلع بڑے زور کا تھا۔ باقی اللہ خیر صلا۔

لکھا ہوا ہی یہی ماہ جبیں کے پرے میں   نہیں ہی کوئی اب ایاز میں کے پردے میں

استاد ذوق کے چھیڑنے کو غالب، مومن، آزردہ، صہبائی، غرض جتنے استادانِ فن تھے سب نے میاں شوق کی بڑی واہ واہ کی وہ سمجھے کہ میرے کلام کی تعریف ہو رہی ہے، یہ نہ سمجھے کہ بنا رہے ہیں۔ ذرا کسی نے واہ واہ کی اور انھوں نے استاد ذوق کی طرف دیکھکر کہا "دیکھو شعر یوں کہتے ہیں" وہ بیچارے ہنس کر خاموش ہو جاتے، ان کے ایک آدھ شاگرد نے جواب دینا بھی چاہا مگر انھوں نے روک دیا۔

خدا خدا کرکے ان سے فراغت ہوئی تو شمع آزاد کے سامنے آئی۔ ان کا نام الکزنڈر ہیڈلے ہے، قوم کے فرانسیسی ہیں، دہلی میں پیدا ہوئے۔ یہیں تربیت پائی اور یہیں سے توپ خانے کے کپتان ہو کر الور گئے۔ کوئی ۲۱ سال کی عمر ہے۔ ڈاکٹری بھی جانتے ہیں، شعر و سخن کا بہت شوق ہے۔ عارف کے شاگرد ہیں جہاں مشاعرے کی خبر سنی اور دہلی میں آموجود ہوئے۔ لباس تو وہی فوجی ہے مگر بات چیت اردو میں کرتے ہیں۔ ایسی صاف اردو بولتے ہیں جیسے کوئی دہلی والا بول رہا ہے۔ شعر بھی کچھ برے نہیں ہوتے۔ ایک فرانسیسی کا اردو میں ایسے شعر کہنا واقعی کمال ہے۔ غزل ملاحظہ ہو:-

وہ گرم رو راہ معاصی ہوں جہاں میں   گرمی سے رہا نام نہ دامن میں تری کا

کچھ پاؤں میں طاقت ہو تو کر دشت نوردی   ہاتھوں سے ہو آزاد کچھ زرا جیب دری کا

جہلم کو عیادت کے لئے وہ مرے آئے   آزاد ٹھکانا بھی ہی اس بے خبری کا

آزاد کے بعد شمع دوسری طرف میر شجاعت علی تسلی کے پاس آئی۔ بیچارے غریب صورت، فرسودہ لباس کوئی ۵۰، ۶۰ برس کے آدمی ہیں شاہ نصیر کے

بڑے چاہیتے شاگردوں میں تھے۔ اپنے زمانے کے جرأت سمجھے جاتے تھے اب بہت دنوں سے دنیا سے کنارہ کشی کرکے قدم شریف میں جا رہے ہیں مشاعرہ کی کشش کبھی کبھی ان کو دہلی کھینچ لاتی ہے۔ پڑھنے کا انداز بھی نرالا ہے اس طرح پڑھتے ہیں جیسے کوئی باتیں کرتا ہو۔ غزل دیکھ لیجئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ عاشق و معشوق میں سوال و جواب ہو رہے ہیں:

کیسی ٹھوکر پڑ رہی ہے حضرت دل — پاؤں پر اس کے سر دھرو تو سہی

جب کہا میں نے تم پہ مرتا ہوں — تم گلے سے مرے لگو تو سہی

بولے وہ کیا مزے کی باتیں ہیں — خیر سے کچھ بھی ہے کہو تو سہی

غیر سے کل وہ لگ کے چھاتی سے — مجھ سے کہنے لگے سنو تو سہی

اس لئے اس کے ہم گلے سے لگے — کہ ذرا جی میں تم جلو تو سہی

اس غزل کی جیسی تعریف ہونی چاہئے تھی ویسی نہیں ہوئی کیوں کہ اب وہ وقت آگیا تھا کہ نیند کے خمار سے سر میں چکر آنے لگے تھے اور بیٹھے رہنے کی تمیز دشوار ہو گئی تھی۔ اس کے بعد جو دو غزلیں پڑھی گئیں وہ ایسی ہو گئیں۔ نہ کسی نے شوق سے سنا اور نہ مزہ آیا۔

میاں تسلی کے بعد شور نے غزل پڑھی۔ یہ کوئل کے رہنے والے ہیں۔ قوم کے عیسائی ہیں اور نام جارج پیش ہے۔ معلوم نہیں کہ کس کے شاگرد ہیں۔ یہاں اکثر دہلی آتے جاتے رہتے ہیں جو کچھ کہہ لیتے ہیں بہت خوب کہتا ہے۔ غزل:

عاجز تھا اپنی جان سے ایسا مرا طبیب — دیکھے سے جس کے حالت عیسیٰ تباہ تھی

دل سے یہ بیخودی کہ خودی کو بھلا دیا — ورنہ یہ زیست مرگ کی اپنے گواہ تھی

دیر و حرم میں تو نے دی ترجیح زاہدا ۔۔۔ جس طرف سر جھکا وہی اپنی سجدہ گاہ تھی

ان کے بعد محمد عسکری نالاںؔ کی باری آئی۔ بھلا اس نوّے برس کے بڈھے کی آواز نیند کے خمار میں کسی کو کیا سنائی دیتی۔ مصحفیؔ کے سب سے پہلے شاگرد ہیں اب تو ان کو بس تبرک سمجھ لو۔ شعر بھی وہی باوا آدم کے وقت کے کہتے ہیں۔

سحر کے ہونے کا دل کو خیال رہتا ہے ۔۔۔ شب وصال بھی دل کو ملال رہتا ہے

وہ بدگمان ہوں کہ اس بت کے سایہ پر بھی مجھے ۔۔۔ رقیب ہی کا سدا احتمال رہتا ہے

میاں نالاںؔ نے پڑھنا ہی ختم کیا تھا کہ شمع میر صاحب کے سامنے پہنچ گئی۔ شمع کا رکنا تھا کہ ہر شخص سنبھل کر بیٹھ گیا۔ بعض نے انگلیوں سے آنکھیں مل لیں، بعض نے کرتے کے دامن سے رگڑ لیں۔ بعض اٹھے اور پانی کا چھپکا منہ پر مار آ بیٹھے۔ کیسی نیند اور کہاں کا سونا۔ میر صاحب کے نام نے سب کو چاق چوبند کر دیا۔ مرزا فخرو اب تک ایک پہلو بیٹھے تھے۔ انھوں نے بھی پہلو بدلا۔ استادانِ فن کے چہروں پر مسکراہٹ آ گئی۔ نوجوانوں میں سرگوشیاں ہونے لگیں۔ میر صاحب شمع سے کچھ آگے نکل آئے۔ مرزا فخرو نے کہا "میر صاحب، یہ ٹھیک نہیں آپ تو بیچ میں آ کر پڑھیے" یہ کہکر چوبدار کو اشارہ کیا۔ اس نے دونوں شمعیں اٹھا کر وسط محفل میں رکھ دیں۔ میر صاحب بھی اپنی جگہ سے اٹھ شامیانے کے عین سامنے آ بیٹھے۔ بھلا دلی میں کون ہے جو میر صاحب کو نہیں جانتا، کونسا مشاعرہ ہے جو ان کی وجہ سے چمک نہیں اٹھتا، کونسی محفل ہے جہاں ان کے قدم کی برکت سے رونق نہیں آ جاتی۔ ان کا نام تو شاید گنتی کے چند لوگ جانتے ہوں۔ ہم نے تو جب سنا ان کا نام میر صاحب ہی سنا۔ کوئی ستر برس کی عمر ہے، بڑے سوکھے سہمے آدمی ہیں۔ غلافی آنکھیں، طوطے کی چونچ جیسی ناک، بڑا دہانہ، لمبی

داڑھی، ٹھیا سا سر، خشخاشی بال، گوری رنگت، اونچا قد۔ غرض ان کے حلیے کو دلی کے
کسی بچے سے بھی پوچھیے تو پورا پورا بتا دے، نہایت صاف ستھرا لباس، سفید ایک
بر کا پاجامہ، سفید کرتہ اس پہ سفید انگرکھا، سر پہ ارخچین کی ٹوپی، چہرے پر متانت
بلا کی تھی۔ مگر جب غصہ آتا تھا تو پھر کسی کے سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ چھوٹا ہو یا بڑا
کوئی ان سے بغیر مذاق کے بات نہیں کرتا تھا اور یہ بھی تڑ سے وہ جواب دیتے تھے کہ
منہ پھر جائے۔ اس سے ان کو غرض نہ تھی کہ جواب ہو بھی گیا یا نہیں۔ مشاعرے میں
بادشاہ سلامت سے لے کر میاں تمکین تک ان کو چھیڑتے تھے۔ انھوں نے
نہ ان کا برا مانا نہ ان کا، جواب دینے میں نہ ان سے رکے نہ ان سے۔ غزل ہمیشہ
فی البدیہہ پڑھتے تھے، لکھ کر لانے کی کبھی تکلیف گوارا نہیں کی۔ غزل میں مصرعوں کے
توازن کی ضرورت ہی نہ تھی۔ صرف قافیہ اور ردیف سے کام تھا جو کچھ کہنا ہوا نہایت
اطمینان سے نثر میں بیان کرنا شروع کیا۔ بیچ میں دوسروں کے اعتراضوں کا جواب
بھی دیتے رہے۔ جب کہتے کہتے تھک گئے تو ردیف اور قافیے کے شعر کو ختم کر دیا۔
انھوں نے شعر پڑھنا شروع کیا اور چاروں طرف سے اعتراضوں کی بوچھار ہوئی۔
یہ بھلا کب دبنے والے آسامی ہیں، جو کھا لیتے۔ جب زبان سے نہ دبا سکتے
تو زور میں آ کر کھڑے ہو جاتے۔ یہ کھڑے ہوئے اور کسی نہ کسی نے ان کو بٹھا دیا۔
معترض صاحب کو ڈانٹا، میر صاحب کا دل بڑھایا اور پھر وہی اعتراضوں کا سلسلہ
شروع ہوا اور تو اور مولوی مملوک العلی صاحب کو ان سے الجھنے میں مزا آتا
تھا۔ یہ بھی مولوی صاحب کی وہ خبر لیتے تھے کہ اگر ان کا کوئی شاگرد سن لیتا تو مدرسے
سے مولوی صاحب کا سارا رعب داب رخصت ہو جاتا۔

میر صاحب نے شمع کے سامنے بیٹھتے ہی ساری محفل پر ایک نظر ڈالی اور

۱؎ غدر کے بہت بعد میر صاحب کا انتقال ہوا ہے۔ میاں کالے صاحب کے فرزند میاں نظام الدین
— (بقیہ بر صفحہ ٦٩) —

کہا "حضرات! میں آج میاں ٹھڈ ٹھڈ کی شان میں ایک قصیدہ سناؤں گا۔ اپنے منھ میاں مٹھو، یہ اپنی تعریف خود تو بہت کر چکے ہیں اب ذرا دل لگا کر اپنی ہجو بھی سن لیں۔" میاں ٹھڈ ٹھڈ سے سب جلے بیٹھے تھے۔ اب جو سنا کہ ان کی ہجو ہونی ہے اور پھر وہ میر صاحب کے منھ سے، سب نے کہا "ہاں میر صاحب، ضرور فرمایئے۔" میاں ٹھڈ ٹھڈ حکیم آغا جان عیشؔ کے چہیتے تھے اور ان ہی کے بل پر پھدکتے تھے۔ اب جو حکیم صاحب نے سنا کہ میر صاحب ٹھڈ ٹھڈ کی ہجو پر اتر آئے ہیں تو بہت پریشان ہوئے۔ ڈر تھا کہ کہیں مجھکو بھی نہ لپیٹ لیں۔ دوسرا کوئی ہجو کرے تو جواب بھی دیا جائے۔ بھلا میر صاحب کی بحر طویل کا کون جواب دے سکتا ہے اور تو کچھ بن نہ پڑا میاں ٹھڈ ٹھڈ کو گاؤ تکیہ کے نیچے غائب کر دیا۔ اب جو میر صاحب اُدھر نظر ڈالتے ہیں تو ٹھڈ ٹھڈ ندارد ہیں۔ بہت گھبرائے ادھر دیکھا اُدھر دیکھا، جب کسی طرف نظر نہ آئے تو کہا "ہجو ملتوی کر کے اب غزل پڑھتا ہوں۔" سب نے کہا "ہیں میر صاحب یہ آپ نے ارادہ کیوں تبدیل فرما دیا۔ پڑھئے میر صاحب، خدا کے لئے۔ سوداؔ کے بعد ہجو تو اردو زبان سے اٹھ ہی گئی۔ اگر آپ بھی اس طرف توجہ نہ کریں گے تو غضب ہو جائے گا، زبان ادھوری رہ جائے گی۔" میر صاحب نے کہا "نا بھئی نا میاں ٹھڈ ٹھڈ ہوتے تو ہم کو جو کچھ کہنا تھا ان کے منھ پر کہتے، ان کے پیٹھ پیچھے ان کو کچھ کہنا ہجو نہیں، غیبت ہے۔ اور میں غیبت کرنے والوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔" جب میر صاحب کا یہ رنگ دیکھا تو حکیم آغا جان کے دم میں دم آیا۔ انھوں نے بھی اس ہجو اور غیبت کے فرق سے متعلق چند مناسب الفاظ کہے اور خدا خدا کر کے یہ آئی بلا ٹلی۔

(صفحہ ٦٨ سے پیوستہ) صاحب کے مکان پر جو مشاعرہ ہوتا تھا اس میں بھی یہ شریک ہوتے تھے اس مشاعرہ کے دیکھنے والے اب بھی دہلی میں موجود ہیں۔ ان ہی لوگوں کی زبانی میر صاحب کے حالات معلوم ہوئے اور درج کئے گئے۔ تذکروں میں تو ان بچارے کا ذکر کیوں آنے لگا۔

اب میر صاحب نے غزل شروع کی۔ کیا پڑھا خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ بس
اتنا تو معلوم ہوا کہ "تیر، پیر، کھیر" قافیہ اور "ہے" ردیف ہے۔ اس کے علاوہ
یہ تو کیا خود میر صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ انھوں نے کیا پڑھا اور مضمون کیا تھا
جہاں قافیہ اور ردیف آئی لوگوں نے سمجھ لیا کہ شعر پورا ہو گیا اور تعریفیں شروع
ہو گئیں۔ کسی نے ایک آدھ اعتراض بھی جڑ دیا۔ اعتراض ہوا اور میر صاحب بگڑے
ان کے بگڑنے میں سب کو مزہ آتا تھا۔ اعتراضوں اور میر صاحب کے جوابوں کا
رنگ بھی دیکھ لیجئے۔ غزل میں میر صاحب نے جو ایک مصرعہ کو کھینچنا شروع کیا اور
اتنا کھینچا اتنا کھینچا کہ شیطان کی آنت ہو گیا۔ مولوی مملوک العلی صاحب نے کہا
"اجی میر صاحب! یہ مصرعہ بحر طویل میں جا پڑا۔" میر صاحب نے کہا "مولوی
صاحب! کبھی بحر طویل دیکھی بھی ہے یا یوں ہی سنی سنائی باتوں پر اعتراض ٹھونک دیا۔
پہلے مطول پڑھئے مطول[۱]۔ جب معلوم ہوگا کہ بحر طویل کس کو کہتے ہیں۔" مولوی صاحب
بڑے چکرائے کہنے لگے "میر صاحب بھلا مطول کو بحر طویل سے کیا واسطہ" مارو
گھٹنا پھوٹے آنکھ "آپ کا جو جی چاہتا کہہ جاتے ہیں۔" میر صاحب کو اب کسی
حمایتی کی تلاش ہوئی۔ مولانا صہبائی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے کہا "مولوی صاحب مطول
میں بحر طویل کی بحریں نہیں ہیں تو اور کیا ہے۔ آپ بھی ہمارے میر صاحب کو اپنی
علمیت کے دباؤ سے خاموش کر دینا چاہتے ہیں۔" بس اتنی مدد ملنی تھی کہ میر صاحب
شیر ہو گئے، کہنے لگے "جی ہاں مولوی صاحب آپ سمجھے ہوں گے کہ آپ کے سوا
کسی نے مطول پڑھی نہیں۔ اجی حضرت میں تو روزانہ اس کے دو دو ورد کرتا ہوں
کل ہی اس کی ایک بحر میں غزل لکھنے بیٹھا تھا۔ لکھتے لکھتے تھک گیا، ایک مصرعہ

---

[۱] مطول حضرت امام غزالیؒ کی تصوف میں ایک تصنیف ہے۔ جس کو میر صاحب نے بحر طویل سے متعلق کر دیا۔

کوئی پونے دوسو صفحے میں لکھا، وہ تو کہو کہ بیاض کے صفحے ہی ختم ہو گئے جو مصرعہ ختم ہوا ورنہ خدا معلوم اور کہاں تک جاتا۔" مرزا نوشہ نے کہا "میر صاحب! آپ سچ فرماتے ہیں ہمارے مولوی صاحب نے بحر طویل کہاں دیکھی ہے۔ مجھ سے پوچھو، میرے بھتیجے خواجہ امان کو جانتے ہو؟ اس نے ایک کتاب بوستانِ خیال لکھی ہے بڑی بڑی اور موٹی ۱۲ بارہ جلدیں ہیں، بحر طویل کے بس بارہ مصرعوں میں ساری جلدیں ختم ہو گئی ہیں۔ آپ کا مصرعہ بحر طویل ہے ہی نہیں، رباعی کی بحر میں ہے۔" میر صاحب بڑے زور سے "ہاں ہیں" کی اور بگڑ کر کہا "مرزا صاحب یہ سیدھے چلتے چلتے بھٹک گئے رباعی کی بحریں آپ کو معلوم بھی ہیں؟ بھلا بتائیے تو سہی کون سی کتاب میں ہیں؟" یہ ذرا ٹیڑھا سوال تھا، مرزا غالب ذرا چپ ہو گئے تو خود میر صاحب نے کہا۔ "میں تو پہلے ہی جانتا تھا کہ آپ نے زبردستی اعتراض کر دیا ہے" مرزا صاحب اربعین[۱] پڑھئے جب معلوم ہو گا کہ رباعی کی بحریں کون کون سی ہیں۔"

غرض اسی طرح کی خوش مذاقی میں کوئی گھنٹہ بھر گزر گیا۔ ہنستے ہنستے جو آنسو نکلے انھوں نے نیند کے خمار سے آنکھیں صاف کر دیں اور ایسا معلوم ہونے لگا گویا مشاعرہ کا دوسرا دور شروع ہو رہا ہے اور سب لوگ تازہ دم ابھی آکر بیٹھے ہیں۔ جب لوگ اعتراض کرتے کرتے اور میر صاحب جواب دیتے دیتے تھک گئے تو ایک دفعہ ہی میر صاحب نے کہا "حضرت! غزل ختم ہو گئی۔" سب نے کہا "میر صاحب! ابھی مقطع تو آیا ہی نہیں ہے مقطع کی یہ کیسی غزل؟" میر صاحب نے فرمایا! مقطع کی اس شاعر کو ضرورت ہے جو بتانا چاہتا ہے کہ یہ غزل میری ہے۔ ہمیں اس کی ضرورت نہیں، ہماری غزل کی یہی پہچان ہے، جہاں شروع کی بس معلوم ہو گیا کہ

---

[۱] اربعین فی اصول الدین حضرت امام غزالیؒ کی ایک مشہور تصنیف ہے جس کو میر صاحب نے رباعیوں کی بحروں سے متعلق کر دیا ہے۔

یہ میر صاحب کے سوا اور کسی کی نہیں ہو سکتی"۔ یہ کہتے کہتے انھوں نے جزدان گردانا اور اپنی جگہ آ بیٹھے۔ ایک شمع اٹھا کر میر صاحب کے عین مقابل کے شاعر مرزا جمعیت شاہ ماہر کے سامنے رکھ دی گئی۔ یہ شاہ عالم شاہ غازی انار اللہ برہانہ کے پوتے اور صابر کے شاگرد ہیں کلام صاف اور زبان بڑی میٹھی ہے۔ لکھا تھا:

ہم بھی ضرور کعبے کو چلتے پر اب تو شیخ | قسمت سے بتکدے ہی میں دیدار ہو گیا
ناصح کی بات سننے کا کس کو یہاں دماغ | تیرا ہی ذکر تھا کہ میں ناچار ہو گیا
اے ہمنشیں وہ حضرت ماہر نہ ہوں کہیں | ایک پارسا تھا کہ مئے خوار ہو گیا

میر صاحب کے کلام نے سب کی آنکھوں سے نیند کا خمار آتار دیا تھا۔ اس لئے اس غزل کی جیسی چاہیے ویسی تعریف ہوئی اور میاں ماہر کو محنت کا پورا پورا صلہ مل گیا۔ اس کے بعد شمع قاضی نجم الدین برق کے سامنے آئی۔ یہ سکندر آباد کے رہنے والے ہیں۔ کوئی ۲۰، ۲۲ برس کی عمر ہے سر پر لمبے لمبے بال، سانولی رنگت اس پر سبزی جھلکتی ہوئی، اونچا قد، وجیہ صورت، سفید غرارہ دار پاجامہ، سفید انگرکھا، دو پلڑی ٹوپی، بڑے خوش مزاج، شیریں کلام، ہنس مکھ، بذلہ سنج، وارفتہ مزاج، رند مشرب آدمی ہیں۔ پہلے مومن خاں کے شاگرد تھے پھر ان کے ایما سے میاں تسکین کو کلام دکھانے لگے۔ آواز بڑی دل کش اور طرز ادا خوب ہے، غزل ایسی پڑھی کہ واہ واہ، کہتے ہیں:

بزم اغیار میں ڈر ہے نہ خفا تو ہو جائے | ورنہ اک آہ جو کھینچوں تو ابھی ہو ہو جائے
حرم و دیر کے جھگڑے ترے چھپنے سے پڑے | ورنہ تو پردہ اٹھا دے تو تو ہی تو ہو جائے
کچھ مزہ ہی یہ ترے روٹھ کے من جانے کا | چاہتا ہوں یونہی ہر روز خفا تو ہو جائے

تو تو جس خاک کو چاہے وہ بنے بندۂ پاک — میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے

آپ انکار کریں وصل سے میں درگزرا — کچھ تو ہو جس سے طبیعت مری یکسو ہو جائے

ہو نہ ہو بس میں کوئی کچھ نہیں اس کی پروا — دل بیتاب پہ اب تو جو قابو ہو جائے

اللہ اللہ! در و دیوار سے بے خودی برس رہی تھی، جب یہ مصرعہ پڑھا کہ "میں خدا کس کو بناؤں جو خفا تو ہو جائے" تو ساری محفل پر ایک مستی سی چھا گئی اور تو اور استادانِ فن کی بھی یہ حالت تھی کہ بار بار شعر پڑھواتے، خود پڑھتے اور مزے لیتے تھے۔ ابھی ان کی تعریفیں ختم نہ ہوئی تھیں کہ شمع مرزا منجھلے المتخلص بہ مفتوں کے سامنے رکھی گئی۔ یہ نوجوان آدمی ہیں، مرزا کریم بخش مرحوم کے فرزند اور حضرت ظلِ سبحانی کے نواسے ہیں۔ ان کا کیا کہنا، زبان تو ان کے گھر کی لونڈی ہے، گا کر پڑھتے ہیں، پڑھتے کیا ہیں جادو کرتے ہیں۔ ان کی غزل کے دو شعر لکھتا ہوں۔

اللہ رے جذبۂ دلِ مضطر کہ تیر کا — باہر ہمارے پہلو سے سوفار بھی نہیں

کچھ آپ ہی آپ دل ہے کہ بیٹھا جائے ہے — ظاہر میں تو الگ ہیں بیمار بھی نہیں

دوسرے شعر میں الفاظ کیا بٹھائے ہیں، نگینے جڑ دیئے ہیں۔ آخر کیوں نہ ہو قلعہ کے رہنے والے ہیں۔ ان کے بعد سیدھی جانب سے شمع سرک کر لالہ بالمکند حضور کے سامنے آئی۔ یہ ذات کے کھتری اور خواجہ میر درد کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۷۰، ۸۰ برس کا سن ہے، سفید نورانی چہرہ، اس پر سفید لباس، بغل میں انگوچھا، کاندھوں پر سفید کشمیری رومال، بس جی چاہتا تھا کہ ان کو دیکھتے ہی جائیے۔ شمع سامنے آئی تو انہوں نے عذر کیا کہ میں اب شعر کہنے کے قابل نہیں رہا

سننے کے قابل رہ گیا ہوں۔ جب سبھوں نے اصرار کیا تو انھوں نے یہ قطعہ پڑھا:

نہ پاؤں میں جنبش نہ ہاتھوں میں طاقت ۔۔۔ جو اٹھ کھینچیں دامن ہم اس دلربا کا
سرِ راہ بیٹھے ہیں اور یہ صدا ہے ۔۔۔ کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا

قطعہ اس طرح پڑھا کہ خود تصویر ہو گئے "نہ پاؤں میں جنبش" کہتے ہوئے اٹھے مگر پاؤں نے یاری نہ کی، لڑکھڑا کر بیٹھ گئے۔ "نہ ہاتھوں میں طاقت" کہہ کر ہاتھ اٹھائے مگر ضعف سے وہ بھی کچھ یوں ہی سے اٹھ کر رہ گئے دوسرا مصرعہ ذرا تیز پڑھا۔ تیسرا مصرعہ پڑھتے وقت اس طرح بیٹھ گئے جیسے کوئی بے دست و پا سرِ راہ بیٹھ کر صدا لگاتا ہے اور ایک دفعہ ہی دونوں آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھا کر جو چوتھا مصرعہ پڑھا تو یہ معلوم ہوتا تھا گویا ساری مجلس پر جادو کر دیا ہر ایک کے منہ سے تعریف کی بجائے بے ساختہ یہی نکل گیا "کہ اللہ والی ہے بے دست و پا کا"۔ استاد ذوق نے کہا "استاد یہ خدا کی دین اور خواجہ میر درد کا فیض ہے۔ سبحان اللہ! کیا مؤثر کلام ہے ہم دنیا داروں میں یہ اثر پیدا ہونے کے لئے میر درد ہی جیسا استاد چاہیے"۔

اس کلام کے بعد مرزا ابوالظفر محی الدین اشکی کی غزل بھلا کون سنتا ہے شاہ عالم بادشاہ غازی کے پوتے ہیں۔ کوئی ۴۰ سال کی عمر ہے اونچا قد سفید پوش تنفہ صورت آدمی ہیں۔ پہلے نظام الدین ممنون سے اصلاح لیتے تھے اب مفتی صدر الدین کے شاگرد ہو گئے ہیں۔ لکھا تھا۔

کچھ وجد نہیں نغمۂ مطرب ہی پہ موقوف ۔۔۔ کافی ہے یہاں نالۂ بے ربط درا کا
سجدے میں گرے دیکھ کے تصویرِ بتاں شیخ ۔۔۔ معلوم ہوا آپ کا خرقہ تھا ریا کا

ان کے بعد شمع صاحبزادہ عباس علی خاں بیتاب کے سامنے آئی۔ ۳۰، ۳۲ برس کا سن ہوگا۔ رام پور کے رہنے والے اور مومن خاں کے شاگرد ہیں۔ نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے بڑی دوستی ہے۔ ان ہی کے ساتھ مشاعرہ میں آگئے تھے۔ بڑی اونچی آواز میں غزل پڑھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ تحت اللفظ پڑھ رہے ہیں۔ غزل تو کچھ اچھی نہ تھی مگر قطعہ ایسا تھا کہ تعریف نہیں ہو سکتی ہے خانے کی تقسیم ایسی خوبی سے کی تھی کہ سبحان اللہ۔ ہائے لکھا ہے:

معمورۂ خدا کی عنایت سے ہے کدہ ساقی اگر نہیں ہے نہ ہو مے سے کام ہے
بیتاب پی خدا نے تجھے بھی دیے ہیں ہاتھ یہ خم ہے یہ سبو ہے یہ شیشہ یہ جام ہے

بھلا ایسے بڑے مشاعرے میں مرزا فخر الدین حشمت کو پڑھنا کیا ضرور تھا نہ کلام ہی اچھا نہ پڑھنے کی طرز ہی اچھی۔ مگر ان کو روک کون سکتا تھا شہزادے تھے اور وہ بھی شاہ عالم بادشاہ کے پوتے۔ خیر پڑھ لیا اور بھائی بندوں نے تعریفیں بھی کر دیں، خوش ہو گئے۔ غزل یہ تھی:

ترے بیمار ہجراں کا ترے بن یہ عالم ہے کہ عالم نوحہ گر ہے
مجھے روتے جو دیکھا ہنس کے بولے مرے حشمت بتا کیوں چشم تر ہے

ہاں ان کے بعد جس کے سامنے شمع آئی وہ نوجوان ہی مگر شاعر ہے اور ایسا شاعر ہوگا کہ ہندوستان بھر میں نام کرے گا۔ بھلا کون سا مشاعرہ ہے جس میں مرزا قربان علی بیگ سالک کی غزل شوق سے نہیں سنی جاتی اور کون سا شعر ہوتا جو بار بار نہیں پڑھوایا جاتا ہو۔ ایک دفعہ بھی کسی مشاعرہ میں گیا ہے وہ ان کو دور سے پہچان لے گا۔ چھوٹا قد۔ دبلے پتلے ہاتھ پاؤں

ٹی سی ناک، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، موٹی جلد، گندمی رنگ اس پر چیچک کے داغ، چھدری چھدری سی داڑھی، گالوں پر کم ٹھوڑی پر زرا زیادہ، سر پر خشخشی سی بال، گولی۔ ۳۰ سال کی عمر۔ بس بخارا کے ترک معلوم ہوتے ہیں۔ ہاں لباس ان لوگوں سے مختلف ہے۔ نیچی چولی کا انگرکھا، تنگ موہری کا پاجامہ سر پر سفید گول ٹوپی، ہاتھ میں سفید لٹھے کا رومال۔ شمع کا ان کے سامنے آنا تھا کہ سب سنبھل کر بیٹھ گئے۔ انھوں نے بھی انگرکھے کی آستین الٹی ٹوپی کو اچھی طرح جما اپنے استاد مرزا غالب کی طرف دیکھا۔ ادھر سے مسکرا کر کچھ اشارہ ہوا تو انھوں نے صاحب عالم کی طرف دیکھ کر عرض کی ''اجازت ہے؟'' مرزا فخرو نے کہا ''ہاں میاں سالک پڑھو، آخر اس میں اجازت کی ضرورت ہی کیا ہے'' سالک نے جیب میں سے کاغذ نکالا، کچھ الٹا پلٹا پھر ایک بار سنبھل کر کہا ''عرض کیا ہے!''

انتہا صبر آزمائی کی ۔۔ ۱ ۔۔ ہے درازی شبِ جدائی کی

ہے برائی نصیب کی کہ تجھے ۔۔ ۲ ۔۔ تم سے امید ہے بھلائی کی

نقش ہے سنگِ آستاں پہ ترے ۔۔ ۳ ۔۔ داستاں اپنی جبہ سائی کی

ہے فغاں بعد امتحانِ فغاں ۔۔ ۴ ۔۔ پھر شکایت ہے نارسائی کی

کیا کرتا وصال شادیِ مرگ ۔۔ ۵ ۔۔ تم نے کیوں مجھ سے بے وفائی کی

راز کھلتے گئے مرے سب پہ ۔۔ ۶ ۔۔ جس قدر اس نے خود نمائی کی

کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں ۔۔ ۷ ۔۔ بندے بنا سے ہیں پر خدائی کی

سارہ گئیں دل میں حسرتیں سالک   آ گئی عمر پارسائی کی

ایک ایک شعر پر یہ عالم تھا کہ مجلس لوٹی جاتی تھی۔ ایک شعر کئی کئی بار پڑھوایا جاتا تھا ایک ایک لفظ پر تعریفیں ہوتیں اور ایک ایک بندش کی داد ملتی۔ استاد ذوق نے تیسری شعر پر کہا "واہ سالک! کیا کہنا ہے۔ سب ہی جیسا لی باندھتے آئے ہیں، تمہاری داستان کو کوئی نہیں پہنچا۔ کیا کلام ہے، کیا روانی ہے۔ سبحان اللہ" حکیم مومن خاں نے کہا "میاں سالک یہ جوانی اور مقطع میں یہ بوڑھا مضمون، تمہاری "عمر پارسائی" کو بہت دن پڑے ہیں، ابھی سے تو بڈھوں کی باتیں نہ کرو" میاں سالک نے جواب دیا "استاد میں تو جوانی ہی میں بڈھا ہو گیا، دیکھئے بڑھاپا دیکھنا نصیب بھی ہوتا ہے یا نہیں، پھر دل میں آتے ہوئے مضمون کیوں چھوڑ دوں، بعد میں یہ کون دیکھتا پھرے گا کہ یہ شعر بڈھے نے کہا تھا یا جوان نے۔ ہم نہ رہیں گے مضمون رہ جائے گا" جب تعریفوں کا سلسلہ ذرا رکا تو شمع مرزا رحیم الدین ایجاد کے سامنے آئی۔ یہ شہزادے مرزا حسین بخش کے صاحبزادے اور مولٰنا صہبائی کے شاگرد ہیں۔ کوئی ۲۴، ۲۵ سال کی عمر ہے شعر کہتے ہیں مگر ٹھیک ٹھاک پڑھتے اچھی طرح ہیں۔ گانا خوب جانتے ہیں، ان کی آواز شعر کی کمزوری ظاہر ہونے نہیں دیتی۔

بت خانے میں تھا یا کہ میں کعبے کے قریں تھا

اے زاہد ناداں تجھے کیا ہے میں کہیں تھا

ہرچند کہ میں دوست کے ہمراہ نہیں تھا

پر دل وہ بلا ہے وہ جہاں تھا یہ وہیں تھا

توڑا ہے یہ کچھ آپ کو میں نے کہ جہاں ہیں
ثابت نہ رہا نام کا جو میرے نگیں تھا

غزل میں تو کیا خاک مزا آتا ہاں ان کے گانے میں مزا آگیا۔ گا کر پڑھنے کا یہ رنگ قلعہ سے چلا ہے۔ مگر استادانِ فن اس کو پسند نہیں کرتے

ان کے بعد شمع نواب علاء الدین خاں علائی کے سامنے آئی انھوں نے بہت اونچی آواز میں اپنی غزل سنائی۔ علائی مرزا غالب کے بڑے چہیتے شاگرد ہیں۔ ابھی تو عمر میں بڑے ہو کر اچھے شاعر نکلیں گے۔

شمع کا سامنے رکھنا تھا کہ مرزا کریم الدین رسا سنبھل کر بیٹھ گئے۔ ایک بڑی لمبی غزل پڑھی مگر ساری کی ساری بے مزہ۔ نہ الفاظ کی بندش اچھی نہ مضامین میں کوئی خوبی تعقیدوں سے الجھن پیدا ہوتی تھی اور رعایت لفظی سے جی گھبراتا تھا۔ ان کے بس دو ہی شعر نمونے کے طور پر لکھ دینا کافی سمجھتا ہوں :

یاد آتا تو مجھکو بہت عشوہ گر نہیں	کرتا کسی پہ ظلم کوئی اس قدر نہیں
تو نزع میں ہاں ہیں ترے بن سے جانِ من	کرنے کی جان ابھی سے تن سے سفر نہیں

یہ پڑھ چکے تو نواب ضیاء الدین خاں نیر رخشاں کے پڑھنے کی باری آئی فارسی کے شعر خوب کہتے ہیں۔ اردو کی غزلیں ذرا پھیکی ہوتی ہیں۔ لکھا تھا :

پی کے گرنے کا ہی خیال نہیں	ساقیا لیجیو سنبھال ہمیں
شب نہ آئے جو اپنے وعدے پر	گزرے کیا کیا نہ احتمال ہمیں

دل میں مضمر ہیں معنی باقی — کسی صورت نہیں زوال ہمیں
تیرے غصے نے ایک دم میں کیا — مردۂ صد ہزار سال ہمیں
طالع بد سے تیر رخشاں — اپنے ہی گھر ہے دو بال ہمیں

ان کے بعد شمع مرزا پیارے رفعت کے سامنے آئی، یہ سلاطین زادے ہیں شعر پڑھنے کا بڑا شوق ہے۔ شعر بھی خوب کہتے ہیں، پڑھتے بھی خوب ہیں۔ پہلے احسان کے شاگرد تھے اب مولانا صہبائی سے تلمذ ہے۔ کوئی ۱۸ سال کی عمر ہوگی، لکھا تھا!

بیاں طائر رنگ پریدہ وحشت سے — کسے دماغ ہے اب آشیاں بنانے کا
نہ عذر تھا ہمیں مٹنے میں خاک کے گر ہم — یہ جانتے کہ وہ دامن نہیں بچانے کا
گنہ بھی کون بدمستی تشنہ لبی و تاک — کہ جس نے تم سے بنایا ہے شراب خانے کا
بذوق یار کو دے رخصت جفا کہ یہاں — ہمیں بھی عزم ہے طاقت کے آزمانے کا
ہیں ایک وہ بھی کہ تم سے ہے جن کو راز و نیاز — اور ایک ہم ہیں کہ تکتے ہیں منہ زمانے کا

آخری شعر میں مایوسی کی جو تصویر کھینچی ہے اس کی تعریف نہیں ہو سکتی۔ کوئی نہ تھا کہ اس شعر کے دوسرے مصرعے کو پڑھ پڑھ کر نہ جھومتا ہو اور بار بار واہ واہ اور سبحان اللہ نہ کہتا ہو۔ ہوتے ہوتے میاں عارف کا نمبر آ ہی گیا۔ بھلا ان کو مشاعرے کے انتظام سے کب فرصت تھی جو غزل لکھتے۔ پھر بھی چلتے پھرتے کچھ لکھ ہی لیا تھا، وہی پڑھ دیا۔ اس دن رات کی گردش کے بعد اتنا بھی لکھ لینا کمال ہے۔

غزل تھی۔

اٹھا قدم جو آگے کو اے نامہ بر نہیں — پیچھے تو چھوڑ آئے کہیں اس کا گھر نہیں
اوروں کو ہو تو ہو ہمیں مرنے سے ڈر نہیں — خط لے کے ہم ہی جاتے ہیں گر نامہ بر نہیں
بے التفاتیوں کا ترے شکوہ کیا کریں — اپنے ہی جب کہ نالۂ دل میں اثر نہیں

مطلع کی سب نے تعریف کی۔ استاد احسان نے کہا "میاں عارف! میں بھی شعر کہتے کہتے بڈھا ہو گیا ہوں، لاکھوں شعر سنے، لاکھوں سنائے مگر یہ مضمون بالکل نیا ہے اور کس خوبی سے ادا کیا ہے کہ دل خوش ہو گیا" میاں عارف کے بعد شمع مرزا غلام نصیر الدین عرف مرزا منجھلے کے سامنے آئی، یہ شہزادے ہیں، احسان کے شاگرد ہیں اور قناعت تخلص کرتے ہیں، غزل خاصی کہتے ہیں۔ میں تو یہی کہوں گا کہ شہزادوں میں بہت کم ایسے شاعر ہوں گے۔ غزل تھی:

شوق کو کثرت نظارہ سے تنگ آتا ہے — حشر سے پہلے میسر ہو وہ دیدار مجھے
کعبے تک جانے میں تھی خاطر زاہد ورنہ — دیر میں بھی تھی سدا رخصت دیدار مجھے
جنس دزدیدہ کی مانند ہی الجھاؤ میں جان — کہ نہ لیتا ہے نہ پھیرے ہی خریدار مجھے
رازِ دل لب پہ نہ لانا کبھی منصور کے ہاں — کر دیا بات کے کہنے نے گنہگار مجھے

شمع کا حکیم آغا جان عیش کے سامنے آنا تھا کہ لوگوں میں سرگوشیاں شروع ہوئیں۔ حکیم صاحب بادشاہی اور خاندانی طبیب ہیں، زیور علم سے آراستہ اور کمال سے پیراستہ، صاحب اخلاق، خوش مزاج، شیریں کلام، شگفتہ صورت، جب دیکھیو معلوم ہوتا ہے کہ مسکرا رہے ہیں۔ طبیعت ایسی

ظریف و لطیف اور لطیف سنج پائی ہے کہ سبحان اللہ، میانہ قد، خوش اندام
سر پر ایک ایک انگل بال سفید، ایسی ہی داڑھی، اس گوری سرخ و سفید
رنگت پر کیا بھلی معلوم ہوتی ہے، گلے میں ململ کا کرتہ جیسے چنبیلی کا ڈھیر پڑا ہنس
رہا ہے۔ لیکن کچھ دنوں سے ان کے دوست بھی ان سے ذرا کھنچ گئے تھے، میاں
ہدہد کو پال کر انھوں نے سب سے بگاڑ لی۔ شروع شروع میں تو اس کی
واہی تباہی باتوں پر کسی نے دھیان نہیں کیا۔ لیکن جب اس نے استادوں
پر حملے شروع کیے اس وقت سے ہدہد کے ساتھ حکیم صاحب سے بھی لوگوں کو
کچھ نفرت سی ہو گئی۔ غضب یہ کیا کہ اجمیری دروازے والے مشاعرے میں
خود انھوں نے مرزا نوشہ پر کھلا ہوا حملہ[۵] کر دیا۔ ایک قطعہ لکھا تھا کہ:

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے ‏ مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلام میر سمجھے اور زبان میرزا سمجھے ‏ مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

مولوی مبارک العلی نے کہا "حکیم صاحب! شعر کے سمجھ میں نہ آنے کی دو ہی
صورتیں ہیں یا تو شعر ہی بے معنی ہے یا سمجھنے والے کے دماغ کا قصور ہے۔ ہم
سب تو ان کے شعر کو سمجھتے ہیں، بجز آپ کے ہم غریبوں کو کیوں لپیٹ لیا؟"
مومن خاں نے کہا "جتنی سمجھے تو اس قطعے کے تیسرے مصرعے میں بھی
شاعرانہ تعلی معلوم ہوتی ہے" بہر حال بڑی مشکل سے معاملہ رفع دفع ہوا۔ اس

عہ (۱) مومن خاں کے نجوم پر بھی پردے پردے میں ایک مرتبہ چوٹ کی تھی سہ
وہ بے وقوف ہیں جو لکیر ول کو ہاتھ کی ‏ کہتے ہیں یہ ہے نوشتۂ تقدیر ہاتھ میں
(۲) ہم عصر شعرا کی شکر رنجی پر نہایت خوش اسلوبی سے ایک اور موقع پر چوٹ کی سہ
جو سخن سنج و سخن فہم تھے عالم میں سنا
حیف صد حیف کہ اے عیش وہ انسان نہ رہے (بقیہ بر صفحہ ۸۲)

ہیں، کوئی ۳۵، ۳۴ سال کی عمر ہے اکثر بنارس میں رہتے ہیں، کبھی کبھی دہلی چلے آتے ہیں۔ شکل تو بالکل شاہزادوں کی ہے مگر داڑھی منڈھی ہوئی اور لباس لکھنؤ والوں کا ہے۔ پہلے اپنے والد کے شاگرد ہوئے، پھر **شاہ نصیر** سے اصلاح لی، اب اپنا کلام استاد **ذوق** کو دکھاتے ہیں۔ شطرنج بے مثل کھیلتے ہیں، پہلے **حکیم شرافت علی خاں** سے سیکھی اب **مومن خاں** کو گھیرے رہتے ہیں۔ اشعار ایسا بچاتے ہیں کہ سبحان اللہ شاعر بھی اچھے ہیں مگر محنت نہیں کرتے، زبان کی چاشنی پر مضمون کو نثار کر دیتے ہیں۔ یہ غزل لکھ کر لائے تھے۔

موت ہی چارہ ساز فرقت ہے — رنج مرنے کا مجھ کو راحت ہے

ہو چکا وصل وقت رخصت ہے — اے اجل جلد آ کہ فرصت ہے

روز کی داد کون دیوے گا — ظلم کرنا تمہاری عادت ہے

کارواں عمر کا ہے رخت بدوش — ہر نفس بانگ کوس رحلت ہے

سانس اک پھانس سی کچھ کھٹکتی ہے — دم نکلتا نہیں مصیبت ہے

تم بھی اپنے حیا کو دیکھ آؤ — آج اس کی کچھ اور حالت ہے

پانچویں شعر پر ان کے والد نے ٹوکا اور کہا "میاں حیا! لکھنؤ جا کر اپنی شکل تو بدل آئے تھے اب زبان بھی بدل دی، سانس کو مونث باندھ گئے" حیا نے جواب دیا "جی نہیں قبلہ! میں نے تو استاد **ذوق** کی تقلید کی ہے، وہ فرماتے ہیں

"سینے میں سانس ہو گی اڑی دو گھڑی کے بعد"

بھلا صاحب عالم[1] کب چوکنے والے تھے کہنے لگے "بھلا ہمارے مقابلے میں

[1] قلعے والوں کو خواہ وہ شہزادے ہوں یا سلاطین زادے صاحب عالم کہا جاتا ہے۔

آپ کے استاد کا کلام کہیں سند ہو سکتا ہے، وہ جو چاہیں لکھیں، یہ تو اُردو قلعے ہیں
سانس مذکر ہے یا مونث؟ بیچارے حیا مسکرا کر خاموش ہو گئے۔

ایک شمع مولانا صہبائی کے روبرو آئی۔ ان کی علمیت کا ڈنکا تمام ہندوستان میں بج رہا ہے۔ ایسے جامع الکمال کہاں پیدا ہوتے ہیں ہزاروں شاگرد ہیں۔ اکثر ریختہ کہتے ہیں ان کو اصلاح دیتے ہیں اور خوب دیتے ہیں، مگر خود ان کا کلام تمام و کمال فارسی ہے۔ میں نے تو ریختے میں نہ کبھی ان کی کوئی غزل دیکھی نہ سنی اور مشاعرے میں بھی فارسی کی غزل پڑھی۔ خوب خوب تعریفیں ہوئیں، مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ لوگوں کو مزہ نہ آیا۔

ہیچو شبنم خویش را فارغ ز عالم ساختم — محرم خورشید گشتم با خساں کم ساختم
ہر دم دور چشم ہر دم عالمے تاریک گشت — من مگر شمعم چو رفتم بزم برہم ساختم
کفر در کیشم سپاسِ نعمتِ دیدارِ دوست — جلوہ در ہر رنگ دیدم گریۂ غم ساختم
جرم عشقم را جزا شد جور من از ہجرِ دوست — داغ بر دل بردم و خلدش جہنم ساختم
نیست صہبائی چو جامِ جم نصیبم گو مباد — مے ز خونِ دل کشیدم خویش را جم ساختم

مقطع پر اتنی تعریفیں ہوئیں کہ بیان سے باہر ہے مگر یہ بیچارے فارسی کہیں سمجھتے تھے وہ بیٹھے منہ دیکھا کئے۔ صاف صاف بات تو یہ ہے کہ اردو کے مشاعرے میں فارسی کا ٹھونسنا کچھ مجھے بھی پسند نہ آیا۔

اہاہا! زبان کا لطف اٹھانا ہے تو نواب سید ظہیر الدین حسین خاں ظہیر کو سنئے۔ ابھی ۲۰، ۲۲ سال کی عمر ہے مگر کلام میں خدا نے وہ اثر دیا ہے کہ واہ واہ استاد ذوق کی اصلاح نے اور سونے پر سہاگے کا کام کیا ہے۔ شکل و صورت

سے یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ان کی طبیعت اس بلا کی ہے۔ قد خاصا اونچا۔ چھریرا بدن، کشادہ سینہ، سانولی رنگت، کشادہ دہن، اونچی ستواں ناک، آنکھیں نہ بہت بڑی نہ بہت چھوٹی مگر روشن، گول داڑھی نہ بہت گھنی نہ بہت چھدری، سر پہ پٹے، لباس میں انگرکھا، تنگ مہری کا پاجامہ، سر پہ سفید گول ٹوپی، خوش مزاج اور لطیفہ سنج ایسے کہ منھ سے پھول جھڑتے ہیں۔ پڑھنے کا بھی ایک خاص طرز ہے لکھنؤ والوں کے تحت اللفظ پڑھنے سے ملتا جلتا ہے۔ ساتھ ہی اشاروں سے ایک ایک لفظ کو سمجھاتے جاتے ہیں۔ غزل ہوئی تھی:

جبیں اور شوق اس کے آستاں کا — ارادہ اور ارادہ بھی کہاں کا

لٹا ہے قافلہ تاب و تواں کا — خدا حافظ ہے دل کے کارواں کا

مری درماندگی منزل رساں ہے — سراغ نقش پا ہوں کارواں کا

رہے پابند دل کے دل میں ارماں — قدم منزل نے پکڑا کارواں کا

اٹھا سکتے نہیں سر آستاں سے — غضب ہے بار منت پاسباں کا

ہمیشہ مورد برق و بلا ہوں — مٹے جھگڑا الٰہی آشیاں کا

دل بیتاب نے وہ بھی مٹایا — کسی کو کچھ جو دھوکا تھا فغاں کا

ظہیرا آؤ چلو اب میکدے کو — نکالا زہد و تقویٰ ہے کہاں کا

اور تو اور استادانِ فن نے اس غزل کی ایسی داد دی کہ میاں ظہیر کا دل غنچے کی طرح کھل گیا۔ تیسرے شعر پر تو یہ حالت تھی کہ تعریفوں کا سلسلہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ سلام کرتے کرتے بیچارے کے ہاتھ دکھ گئے ہوں گے

جب ذرا سکون ہوا تو سیدھی جانب کی شمع نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کے
سامنے آئی۔ ان کا کیا کہنا، یہ استادانِ فن میں شمار کئے جاتے ہیں مومن
کے شاگرد ہیں مگر خود استاد ہیں انھوں نے کسی شعر کی تعریف کی اور اس کی قدر
بڑھی یہ سنکر ذرا خاموش ہو گئے اور شعر دوسروں کی نظروں سے کبھی گر گیا زبان
کے ساتھ مضمون کو ترتیب دینا ایسے ہی لوگوں کا کام ہے۔ پڑھتے بھی ہیں تو ایک
ایک لفظ سمجھا سمجھا کر آواز ایسی اونچی ہے کہ دور اور پاس سب کو صاف سنائی دے
غزل پڑھنے سے پہلے ادھر ادھر دیکھا، ذرا انگرکھا درست کیا۔ ٹوپی درست کی
انگرکھے کی آستینوں کو چڑھایا۔ اور یہ غزل پڑھی:

آرام سے ہے کون جہانِ خراب میں — گل سینہ چاک اور صبا اضطراب میں

سب اس میں محو اور یہ سب سے علاحدہ — آئینہ میں ہے آب نہ آئینہ آب میں

معنی کی فکر چاہیے صورت سے کیا حصول — کیا فائدہ ہے موج اگر ہے سراب میں

ذات و صفات میں بھی یہی ربط چاہیے — جوں آفتاب روشنی آفتاب میں

وہ قطرہ ہوں کہ موجۂ دریا میں گم ہوا — وہ سایہ ہوں کہ محو ہوا آفتاب میں

بیباک شیوہ شوخ طبیعت زباں دراز — ملزم ہوا ہے پہ نہیں عاجز جواب میں

تکلیف شیفتہ ہوئی تم کو مگر حضور
اس وقت اتفاق سے وہ ہیں شتاب میں

غزل تو ایسی ہے کہ بھلا کس کا منہ ہے جو تعریف کا حق ادا کر سکے اگر تعریف
سنبھل سنبھل کر کی گئی۔ بڑے مشاعروں میں میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ نو مشقوں
کے دل تو تعریفوں سے خوب بڑھاتے ہیں مگر جب استادوں کے پڑھنے کی

نوبت آتی ہے تو وہ جوش و خروش نہیں رہتا۔ بلکہ جوش کے بجائے متانت زیادہ آجاتی ہے استادوں کے ان ہی شعروں کی تعریف ہوتی ہے جو واقعی تعریف کے قابل ہوں اگر کسی شعر کی ذرا بے جا تعریف کر دی جائے تو اس سے ان کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ صرف اسی کلام کی تعریف چاہتے ہیں جس کو یہ خود سمجھتے ہیں کہ اس کی تعریف ہونی چاہیئے۔ شعر پڑھ کر اگر دیکھتے بھی ہیں تو اپنے برابر والوں کی طرف اور وہی داد بھی دیتے ہیں مشاعرے کے باقی لوگ ان کے کلام سے لطف ہی نہیں اٹھاتے تھے "کچھ حاصل بھی کر لیتے ہیں" ان کے لئے یہ غزلیں کسی طرح استاد کی اصلاح سے کم نہیں ہوتیں۔

ان کے بعد شہزادہ مرزا قادر بخش صابر کی باری آئی۔ یہ کوئی ۴۰ برس کے ہوں گے۔ ان کی شاعری کی قلعہ میں بڑی دھوم ہے۔ خود ان کو بھی اپنے کلام پر ناز ہے۔ شعرائے دہلی کا ایک تذکرہ لکھ رہے ہیں مگر مشہور یہ ہے کہ الف سے لے کر ی تک مولانا صہبائی کا قلم ہے۔ یہ سچ ہے یا جھوٹ خدا ہی بہتر جانتا ہے خود انھوں نے اپنے خیالات ایک قطعہ میں لکھے ہیں وہ نقل کرتا ہوں:

پہلے استاد تھے احسان و نصیر و مومن

ہوئی احسان سے یہ اصلاح طبیعت میری

پھر ہوا حضرت صہبائی کی اصلاح کا فیض

طبع باریک ہوئی ان کی بدولت میری

اور ہم بزم رہے مومن و ذوق و غالب
اوستادوں ہی سے ہر دم رہی صحبت میری

ہند کا فضل و ہنر ذات پہ ہے جن کی تمام
مانتے ہیں وہی اشخاص فضیلت میری

منعقد ہوتی ہے جب شہر میں بزم انشا
کرتے ہیں اہل سخن وقعت و عزت میری

اب اس کلام پر ان کو استاد کہو یا جو جی چاہے کہو غزل میں بھی یہی پھیکا رنگ ہے مضمون بھی کچھ بلند پایہ نہیں ہے مگر سارا شہر ان کو استاد مانتا ہے ہوں گے۔ ممکن ہے میری ہی سمجھ کا پھیر ہو۔ غزل کہی تھی:

نظارہ برق حسن کا دشوار ہو گیا
جلوہ حجاب دیدۂ بیدار ہو گیا

محفل میں پی کے اس لب میگوں کے سامنے
نام شراب لے کے گنہگار ہو گیا

حائل ہوئی نقاب تو ٹھیری نگاہ شوق
پردہ ہی جلوہ گاہ رخ یار ہو گیا

معلوم یہ ہوا کہ ہے پرسش گناہ کی
عاصی گنہ نکردہ گنہگار ہو گیا

اس کی گلی میں آن کے کیا کیا اٹھائے رنج
خاک شفا ملی تو میں بیمار ہو گیا

پیری میں ہم کو قطع تعلق ہوا نصیب
قامت خمیدہ ہوتے ہی تلوار ہو گیا

یہ پڑھ چکے تو شمع مفتی صدر الدین[۵] صاحب آزردہ کے سامنے پہنچی، اس پائے کے عالم شاعر نہیں ہوتے اور ہوتے ہیں تو استاد ہو جاتے ہیں مفتی صاحب کے جتنے شاگرد جید عالم ہیں اس سے کہیں زیادہ ان کے تلامذہ شاعر ہیں اور شاعر بھی کیسے کہ بڑے پائے کے۔ مفتی صاحب کہتے تو خوب ہیں مگر پڑھتے اس طرح ہیں کہ گویا طالب علموں کو سبق دے رہے ہیں آواز ذرا نیچی ہے لیکن ان کی وجاہت کا یہ اثر ہے کہ مشاعرے میں سناٹا ہوتا ہے اور تعریف بھی ہوتی ہے تو خاص خاص شعروں پر اور بہت نیچی آواز میں ہاں مرزا نوشہ ان سے مذاق کرنے میں نہیں چوکتے۔ کبھی کبھی اعتراض بھی کر بیٹھتے ہیں اور ہر شعر کی نوک جھونک ہو جاتی ہے۔ غزل ملاحظہ ہو، کیا پختہ کلام ہے:

باتوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں
کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں

افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند
کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں

شب اس کو حالِ دل نے جتایا کچھ اس طرح
ہیں لب تو کیا نگہ بھی ہوئی ترجماں نہیں

---

[۵] ہنگامہ ۱۸۵۷ء میں جنرل بخت خاں نے فتویٰ جہاد پر مولانا فضل حق کے دستخط کرائے، مفتی صاحب سے مہر لگوائی، آپ نے مہر کے ساتھ یہ الفاظ لکھ دیے "فتویٰ بالجبر" بخت خاں نے اس لفظ کو "بالخیر" سمجھا۔ بعد از فتح دہلی ——— (بقیہ بر صفحہ ۹۰)

اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں
ایک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں

کٹتی کسی طرح بھی نہیں یہ شب فراق
شاید کہ گردش آج تجھے آسماں نہیں

کہتا ہوں اس سے کچھ میں نکلتا ہے منہ سے کچھ
کہنے کو یوں تو ہے گی زباں اور زباں نہیں

آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اس کے روبرو
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں

آزردہ جیسے استاد کے بعد نواب مرزا خاں داغ کا پڑھنا ایک عجیب سی چیز ہے مگر بات یہ ہے کہ اول تو داغ کو سب چاہتے ہیں دل بڑھاتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کسی دن یہی داغ ہندوستان کا چراغ ہوگا، دوسرے

(صفحہ ۸۹ سے پیوستہ) سرکار نے پکڑ بلوایا، جائداد ضبط کی اور جیل بھجوا دیا۔ ایک ترکیب بند لکھ ڈالا جس کا ایک شعر یہ ہے ؎

آپ پھنسے بیڈ حب الٰہی دیکھئے کیسے بنے
ہر ہیں سب الٰہی دیکھئے کیسے بنے

فتویٰ کی ثبوت میں پیش ہوا۔ آپ نے علمی استدلال سے کہا "صاف ظاہر ہے جبر کے نیچے میں نے دیا تجیر" لکھا ہے نہ کہ "دیا تکفیر" حکومت نے اس عذر پر چھوڑ دیا اور لاٹ صاحب نے نصف جائداد واگزاشت کر دی۔

؎ ایک دن ایک صاحب تشریف لائے حضرت د آغ عصر کی نماز (بقیہ) بر صفحہ (۹۱)

مرزا فخرو کے خیال سے ان کو استادوں میں جگہ ملی تھی مگر انھوں نے غزل بھی ایسی پڑھی کہ استاد بھی قائل ہو گئے ۔ ۱۸۱۷ برس کے لڑکے کا اس قیامت کی غزل اور اس جرأت سے پڑھنا انتہائی کمال ہے ۔ میری تو یہ رائے ہے جو زبان داغ نے لکھی ہے وہ شاید ہی کسی کو نصیب ہوگی ۔ ذرا زبان کی شوخی ، مضمون کی رنگینی اور طبیعت کی روانی ملاحظہ کیجئے ۔ اور داد دیجئے ۔

(صفحہ ۹۰ سے پیوستہ) پڑھ رہے تھے ۔ وہ واپس چلے گئے ۔ نماز سے فارغ ہو کر آپ نے ملازم سے فرمایا کہ انہیں بلا ناوہ جا کر بلا لایا ۔ ان سے پوچھا ۔ کیوں آئے تھے اور پھر کیوں چلے گئے ؟" کہا ۔ "آپ نماز پڑھتے تھے اس لئے چلا گیا ۔" فرمایا "میں نماز پڑھتا تھا **لاحول** تو نہیں پڑھتا تھا ۔

(۲) مرزا مظفر حسین بیگ نے ایک دن دریافت کیا کہ "استاد خدا جانے آپ کس طرح شعر کہتے ہیں ذرا دیر نہیں ہوتی ۔" استاد نے کہا کہ "بھائی تم کس طرح شعر کہتے ہو ؟" انھوں نے کہا "استاد ہم تو کسی خاص وقت پلنگ پر لیٹ کر حقہ سامنے رکھ کر فکر سخن کرتے ہیں ۔ کبھی اس طرف کروٹ لی اور کبھی اٹھے کبھی بیٹھے ۔ اس مشکل سے کوئی شعر نکلتا ہے ۔" فرمایا "آپ شعر نہیں کہتے شعر جنتے ہیں ۔"

(۳) ایک دفعہ ایک صاحب نے داغ کے سامنے ایک تصویر پیش کی ۔ جس میں ایک نازنین جانے کا قصد کر رہی ہے ۔ اس کا عاشق ایک ہاتھ سے اس کا دامن پکڑے ہوئے ہے اور ایک ہاتھ سے اپنے دل کو سنبھال رہا ہے اور کہا کہ استاد اس کیفیت کو اپنے کسی شعر میں ظاہر کیجئے ۔ حضرت داغ نے تھوڑی دیر غور کرنے کے بعد کہا

ہاتھ نکلے اپنے دونوں کام کے — دل کو تھاما ان کا دامن تھام کے

اس مطلع کے بعد انھوں نے غزل کی تکمیل کر لی ۔

—— (بقیہ ملاحظہ صفحہ ۹۲) ——

سازِ یہ کینہ ساز کیا جانیں — نازِ دل لے نیاز کیا جانیں
شمع رو آپ گو ہوئے لیکن — لطفِ سوز و گداز کیا جانیں

(صفحہ ۹۱ سے پیوستہ)

(۴) نواب عزیز یار جنگ بہادر فرماتے ہیں کہ داغ کے ہاں ایک طوائف ملازم تھی عمر میں کوئی بیس بائیس برس کی ہوگی ایک دفعہ داغ نے اس کو اپنے کسی آدمی کے ذریعے بلا بھیجا۔ اس نے آدمی سے یہ کہا کہ اُن سے کہہ دے "میری بلا بھی نہیں آتی"۔ ملازم نے یہی جملہ داغ سے آکر دہرایا۔ داغ لطف اندوزی کے خاطر بار بار اس سے دریافت کرتے تھے کہ اس نے کیا کہا اور وہ اسی جملہ کو دہراتا تھا اسی کیفیت میں یہ شعر کہا ہے ؎

یہ کیا کہا کہ میری بلا بھی نہ آئے گی
کیا تم نہ آؤ گے تو قضا بھی نہ آئے گی؟

اور تھوڑی دیر میں غزل پوری کرلی۔

(۵) داغ کے پاس ایک وقت مولوی ابوالحمید آزاد بیٹھے ہوئے تھے ان کو پیاس لگی اور انھوں نے پانی منگوایا، ایک چھوکری جس کی عمر بارہ تیرہ برس کی ہوگی پانی لے آئی اور ہوا کے زور سے اس کا دوپٹہ شانہ پر سے سرک گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ سینے پہ رکھ لئے۔ داغ کی نظر بھی اس سماں سے لطف اٹھا رہی تھی انھوں نے آزاد سے کہا کہ قلم لو اور لکھو ؎

بادِ صبا نے بھی نہ کیا اس کو بے حجاب — سینے پہ ہاتھ آگئے جب شانہ کھل گیا

(۶) نواب عزیز یار جنگ بہادر فرماتے ہیں کہ رامپور میں زنانخانہ سے داغ کچھ سوچتے ہوئے باہر تشریف لائے، ان کے ایک شاگرد بشیر نے دریافت کیا استاد خیر تو ہے انھوں نے کہا کہ آج تمہاری استانی ہم پر (بقیہ ۹۳ صفحہ پر)

کب کسی در پہ جبہ سائی کی　　شیخ صاحب نماز کیا جانیں
جو رہ عشق میں قدم رکھیں　　وہ نشیب و فراز کیا جانیں

(صفحہ ۹۲ سے پیوستہ) خفا ہیں، کہتی ہیں کہ اس سے (حجاب جو کلکتہ کی مشہور طوائف، سخن گو، سخن فہم اور بہترین گانے والی) ہمارے تعلقات صرف گانے کا لطف اٹھانے کی حد تک نہیں رہیں بلکہ خلوت میں بھی اس سے ملاقاتیں ہونے لگی ہیں اور ہنستے ہوئے یہ شعر پڑھا ؎

تم کو ہے وصل غیر سے انکار
اور جو ہم نے آکے دیکھ لیا

اور فرمایا مضمون تمھاری استانی کا ہے اور شعر ہمارا۔

(۷) مولانا حالی مرزا غالب کے ذکر میں لکھتے ہیں، "ایک صحبت میں نواب مرزا خاں داغ کے اس شعر کو مرزا غالب بار بار پڑھتے تھے اور اس پر وجد کرتے تھے

رخ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

(۸) احسن مارہروی فرماتے تھے کہ ایک دن داغ مختلف افکار شعر و سخن کے ضمن میں فرمانے لگے کہ استاد ذوق نے تمام عمر میں ایک شعر مجھے دیا وہ یہ ہے ؎

رکھیو قدم سنبھل کے رہ عشق میں دہی　　آگے کبھی جس کے ہو کبھی ٹھوکر لگی ہوئی

اس کے ساتھ میرا یہ مصرع انھوں نے مانگ لیا ع

رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

اور اس پر مصرع لگا کر مطلع کر لیا جو مشہور ہے ؎

ہے تیرے کان زلف معنبر لگی ہوئی　　رکھے گی یہ نہ بال برابر لگی ہوئی

(۹) نواب کلب علی خاں نے حج کا ارادہ کیا تو حضرت داغ نے (بقیہ بر صفحہ ۹۴)

پوچھے میکشوں سے لطف شراب — یہ مزا پاک باز کیا جانیں
جن کو اپنی خبر نہیں اب تک — وہ مرے دل کا راز کیا جانیں

(صفحہ ۹۳ سے پیوستہ) کس خوبصورتی سے ان کے ساتھ چلنے کی خواہش کو ظاہر کیا ہے
یہ سنا جو حضرت داغ نے کہ حضور کعبے کو جائیں گے
یہی ذکر ہے یہی فکر ہے شب و روز ہے اسی عزم خوش

غالب نے بھی یہی خواہش ظاہر کی تھی ؎

غالب گر اس سفر میں مجھے ساتھ لے چلیں — حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کی

لیکن غالب کی خواہش پوری نہ ہوئی اور داغ اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے
داغ نے حرم پاک میں کعبۃ اللہ کے سامنے بیٹھ کر یہ غزل لکھی جو اردو ادب میں
مشہور ہے اور مدرسہ کا بچہ بچہ اس سے واقف ہے ؎

سبق ایسا پڑھا دیا تو نے — دل سے سب کچھ بھلا دیا تو نے
ہم نکمے ہوئے زمانے سے — کام ایسا سکھا دیا تو نے
لاکھ دینے کا ایک دینا ہے — دل بے مدعا دیا تو نے
بے طلب جو ملا ملا مجھ کو — بے غرض جو دیا دیا تو نے
جن قدر میں نے تجھ سے خواہش کی — اس سے مجھ کو سوا دیا تو نے
رہبر خضر ہادی الیاس — مجھ کو وہ رہنما دیا تو نے
تھا مرا منہ نہ قابل لبیک — کعبہ مجھ کو دکھا دیا تو نے
داغ کو کون دینے والا تھا — جو دیا اے خدا دیا تو نے

واپسی کے وقت کہتے ہیں ؎

(بقیہ بر صفحہ ۹۵)

حضرتِ خضر جب شہید ہوں لطفِ عمرِ دراز کیا جانیں
جو گزرتے ہیں داغؔ پر صدمے آپ بندہ نواز کیا جانیں

(صفحہ ۹۴ سے پیوستہ) ساتھ نواب کے حج کر کے پھرے ہم اے داغؔ
ہند میں دھوم ہے مہمانِ حجاز آتے ہیں

(۱۰) مرنے سے پہلے حضرت داغؔ اکثر بیان کرتے تھے کہ اب کسی چیز میں مزا نہیں ملتا یعنی کیف محسوس نہیں ہوتی اور نہ کسی کام پر دل لگتا ہے۔ چار ماہ پیشتر کہا کہ اب ہماری زندگی کے دن ختم ہو چکے اب ہم کچھ دنوں کے مہمان ہیں۔ بخطرت مجھے کس قدر شوق ہے۔ گانا سننے کا کس قدر شوق ہے اور اسی شوق کی خاطر میں نے گانے والوں کو اپنے پاس ملازم رکھا۔ غزل کہنے اور سننے کا کس قدر شوق ہے۔ اب مجھے عطر کی بو محسوس نہیں ہوتی۔ گانا سنوں تو وحشت ہونے لگتی ہے۔ غزل کہنے سننے سے طبیعت دور بھاگتی ہے۔ یہ سب اس بات کے ثبوت ہیں کہ میری زندگی کے دن ختم ہو چکے ہیں۔

ہوش و حواس تاب و تواں داغؔ جا چکے اب ہم بھی جانے والے ہیں سامان تو گیا

اس واقعہ کے چار ماہ بعد انتقال کیا۔ ان کی اکثر یہ دعا تھی کہ خدا ان کو حج کے حلف موت دے اور نمازِ جنازہ ان کی نمازِ عید کے ساتھ ہو۔ یہ ان کی دونوں آرزوئیں بر آئیں۔

(۱۱) داغؔ کی اصلاحیں :-

۱۔ احسن مارہروی کا شعر تھا : کسی دن بے خودی میں جا پڑے تھے ان کے سینے پر
بس اتنی سی خطا پر ہاتھ کچلے میرے پتھر سے

اصلاح : کسی دن بیخودی میں جا پڑا تھا ان کے سینے پر بس اتنی سی خطا پر ہاتھ کچلا اس نے پتھر سے

پہلے مصرع میں "جا پڑے" کی جگہ "جا پڑا" اور دوسرے مصرع میں "کچلے" کے بجائے "کچلا" بنا دیا۔ اب اس اصلاح سے بیخودی پورے طور پر ثابت ہو گئی (بقیہ بر صفحہ ۹۶)

اللہ اللہ! وہ سہانا وقت، وہ چھوٹی سی آواز، وہ دل کش صر، وہ الفاظ کی نشست، وہ بندش کی خوبصورتی اور سب سے زیادہ یہ کہ وہ داغ کی بھولی بھالی شکل ایک عجیب لطف دے رہی تھی ساری محفل میں کوئی نہ تھا جو محو حیرت نہ ہوگیا ہو اور کوئی نہ تھا جس کے منھ سے جزاک اللہ سبحان اللہ اور صل علیٰ کے الفاظ بے ساختہ نہ نکل رہے ہوں مرزا فخرو کی تو یہ حالت تھی کہ گھڑی گھڑی پہلو بدلتے اور دل ہی دل میں خوش ہوتے تھے۔ غزل ختم ہوئی

(صفحہ ۹۵ سے پیوستہ) ورنہ حالت بے خودی میں دونوں ہاتھوں کا سینے پر جا پڑنا عین ہوشیاری سمجھی جائے گی۔

احسن۔ کیوں دستِ شوق صبح کو بستر سے چن نہ لے ؎ ہیں یہ پسے ہوئے ترے نازک بدن کے پھول

اصلاح داغ۔ کیوں چشمِ شوق صبح کو بستر سے چن نہ لے ؎ ہیں یہ پسے ہوئے ترے نازک بدن کے پھول

دستِ شوق سے چشمِ شوق میں زیادہ عاجزانہ اشتیاق اور حسن ملحوظ رکھا گیا ہے بیشک اصلاح ہے

عارف۔ خود گلا کاٹا ہے دیکھی ہے جو اس کی نازکی ؎ ہو اگر انصاف قاتل چوم لے بسمل کے ہاتھ

اصلاح داغ۔ خود گلا کاٹا ہے نازک دیکھ کر قاتل کے ہاتھ ؎ " " " " " "

پہلے مصرع کو بدل کر مطلع کر دیا۔ اب اس مطلع کی نزاکت اور شان ملاحظہ ہو۔

خود گلا کاٹا ہے نازک دیکھ کر قاتل کے ہاتھ۔ سبحان اللہ خوب اصلاح دی ہے۔

احسن۔ ڈیوڑھی کی خبر کہہ کے لگائی جو اک صدا ؎ گھر سے نکل ہی آئے سمجھ کے گدا مجھے

اصلاح داغ۔ اس در کی خبر کہہ کے لگائی جو اک صدا ؎ " " " " " "

"اس در کی خبر کہہ کے لگائی جو اک صدا" یہ مصرع کس قدر محاورے میں ڈوبا ہوا ہے۔ جنھیں زبان کا مزہ ہے وہ اس اصلاح کی داد دیں گے۔

(باجازت علیا حضرت نواب سردار جہاں بیگم صاحبہ)

اور کسی کو معلوم نہ ہوا کہ کب ختم ہو گئی۔ جب شمع حکیم مومن خاں مومنؔ[۱] کے سامنے پہنچ گئی اس وقت لوگوں کا جوش کم ہوا اور اس ریختے کے استاد کا کلام سننے کو سب ہمہ تن گوش ہو گئے۔ انھوں نے شمع کو اٹھا کر ذرا آگے رکھا۔ ذرا سنبھل کر بیٹھے، بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کی، ٹوپی کو ترچھا کیا۔ آستینوں کی چنٹ کو صاف کیا اور بڑی دردانگیز آواز میں دل پذیر ترنم کے ساتھ یہ غزل پڑھی:

آئے وہ شکوے کرتے ہیں اور کس ادا کے ساتھ
بے طاقتی کے طعنے ہیں عذرِ جفا کے ساتھ

بہرِ عیادت آئے وہ لیکن قضا کے ساتھ
دم ہی نکل گیا مرا آوازِ پا کے ساتھ

مانگا کریں گے اب سے دعا ہجرِ یار کی
آخر تو دشمنی ہے اثر کو دعا کے ساتھ

---

[۱] مومن خاں کی بلند پروازی و نازک دماغی بہت بڑھی ہوئی تھی ایک شاگرد نے غزل میں یہ شعر پڑھا۔

ہجر میں کیوں کر پھر دل ہر سو شہ گھبرایا ہوا ٭ وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

مومن نے پہلے مصرع کو یوں بدل دیا:

اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا ٭ وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

دیکھیے کہ شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا اور واقعیت کے اظہار نے کتنا اثر پیدا کر دیا۔

(بقیہ صفحہ ۹۸ پر)

ہے کس کا انتظار کہ خوابِ عدم سے بھی
ہر بار چونک پڑتے ہیں آوازِ پا کے ساتھ

سو زندگی نثار کروں ایسی موت پر
یوں روئے زار زار تو اہلِ عزا کے ساتھ

بے پردہ غیر پاس اسے بیٹھا نہ دیکھتے
اٹھ جاتے کاش ہم بھی جہاں سے حیا کے ساتھ

اس کی گلی کہاں یہ تو کچھ باغِ خلد ہے
کس جائے مجھکو چھوڑ گئی موت لا کے ساتھ

(صفحہ ۹ سے پیوستہ) (۳) مومن خان کے ایک شاگرد نے الٰہی بخش کا سجع یہ لکھا تھا

"مجھ گنہگار کو الٰہی بخش"

انھوں نے اس کو یوں بنایا: "میں گنہگار ہوں الٰہی بخش"

اس اصلاح سے اس مصرع میں علاوہ فصاحت کے ایک عجیب معنوی اضافہ ہو گیا یعنی خود الٰہی بخش کا یہ کہنا کہ میں گنہگار ہوں کس قدر معنی خیز اصلاح ہے.

(۴) مرزا اصغر علی نسیم نے ایک مرتبہ یہ شعر پڑھ کر سنایا:

اتنا ہوا ہے غم مجھے ردِّ سوال کا ÷ دریا بہا دیا عرقِ انفعال کا

مومن خان نے اس کو سنکر یہ اصلاح کی.

اس درجہ ہے قلق مجھے ردِّ سوال کا ÷ دریا بہا کیا عرقِ انفعال کا

(بقیہ بر صفحہ ۹۹)

(۸) اللہ رے گمرہی بُت و بت خانہ چھوڑ کر
مومن چلا ہے کعبہ کو اک پارسا کے ساتھ

شاعری کیا تھی جادو تھا۔ تمام لوگ ایک عالم محویت میں بیٹھے تھے۔ وہ خود بھی اپنے کلام کا مزہ لے رہے تھے۔ جس شعر میں ان کو زیادہ لطف آتا تھا اُس کے پڑھتے وقت ان کی انگلیاں زیادہ تیزی سے بالوں میں چلنے لگتی تھیں۔ بہت جوش ہوا تو کاکلوں کو انگلیوں میں بل دے کر مروڑنے لگے۔ کسی نے تعریف کی تو گردن جھکا کر زرا مسکرا دیئے۔ پڑھنے کا طرز بھی سب سے جدا تھا۔ ہاتھ بہت کم ہلاتے تھے اور ہلاتے بھی کیسے ہاتوں کو بالوں سے کب فرصت تھی۔ ہاں آواز کے زیر و بم اور آنکھوں کے اشاروں سے جادو سا کر جاتے تھے۔ غزل ختم ہوئی تو تمام شعرا نے تعریف کی۔ سنکر مسکرائے اور کہا "آپ لوگوں کی یہی عنایت تو ہماری ساری محنت کا صلہ ہے۔ میں عرض کر چکا ہوں ؎

ہم داد کے خواہاں ہیں نہیں طالب زر کچھ
تحسین سخن فہم ہے مومن صلہ اپنا

(صفحہ ۹۸ سے پیوستہ) زمانہ کی قید کے لحاظ سے دونوں مصرعوں میں کس قدر ربط پیدا ہو گیا ہے۔

(۸) مومن کے معمے بہت ہیں مگر یہ لاجواب ہے ایسا سنا نہیں گیا ؎
سینے کیوں کر کہ ہے سب کار الٹا ٭ ہم الٹے بات الٹی یار الٹا

مہ تاب رائے

یعنی (مہتاب رائے)

ان کے بعد شمع استاد احسانؔ کے سامنے آئی ہیں سمجھا تھا کہ ان کی آواز کیا خاک نکلے گی مگر شمع کے پہنچتے ہی وہ تو کیچلی سی بدل کچھ سے کچھ ہوگئے اور اتنی بلند آواز سے غزل پڑھی کہ تمام مجلس پر چھا گئے کسی شعر پر مومن خاں کو متوجہ کرتے کسی پر مرزا نوشہ کو کسی پر استاد ذوقؔ کو ان کی عظمت کچھ لوگوں کے دلوں پر ایسی چھائی ہوئی تھی کہ جس کو انھوں نے متوجہ کیا اس کو تعریف ہی کرتے بن پڑی۔ ردیف سخت اور قافیہ مشکل تھا مگر ان کی استادی کی داد دینی چاہیئے کہ ان دشواریوں پر بھی ساری کی ساری غزل مرصع کہہ گئے ہیں، ہائے لکھتے ہیں۔

تو کیوں ہے گریہ کناں اے مرے دلِ محزوں
نہ رو نہ رو کہ نہ تجھ کو کبھی رلائے خدا
بتو بتاؤ تو کیا تم خدا کو دو گے جواب
خدا کے بندوں پہ یہ ظلم بندہ ہائے خدا

(۱) ایک مرتبہ احسانؔ کے دشمنوں نے ان کی طرف سے کان بھرے "قلعہ میں آمد و رفت سلام و مجرا سب بند کر دیا گیا تھا"، انھوں نے بادشاہ کی خدمت میں ایک قطعہ لکھ کر گزرانا جس کے دو شعر یہ ہیں ؎

حکم والا یہ ہوا قلعہ میں احسان نہ ہو ۔۔۔ سن کے اس بات کو اک شہر کا اوسان گیا
شہر وہ کیا کہ جس شہر میں احسان نہ ہو ۔۔۔ قلعہ وہ کیا کہ جس قلعہ سے احسان گیا

اس کے بعد ان کو آنے جانے کی اجازت مل گئی۔

(۲) بہادر شاہ ہمیشہ ان کی عزت کرتے تھے اور احسانؔ کو تا زیست وظیفہ شاہی عطا کرتے رہے۔ حسب اتفاق —— (بقیہ بر صفحہ ۱۰۱)

رضا پہ تیری ہوں دن رات اے صنم مصروف
جو اس پہ تو نہیں راضی نہ ہو رضائے خدا

بتوں کے کوچے میں کہتا تھا کل یہی احسان
یہاں کسی کا نہیں ہے کوئی سوائے خدا

جب یہ پڑھ چکے تو مرزا غالبؔ کی باری آئی۔ یہ رنگ ہی دوسرا تھا۔ صبح ہو چلی تھی۔ شمع کے سامنے آتے ہی فرمانے لگے "تماشا ہوا میں بھی اپنی بھیرویں الاپتا ہوں" یہ کہکر ایسے دل کش اور مؤثر لہجے میں غزل پڑھی کہ ساری محفل محو ہو گئی آواز بہت اونچی اور پُر درد تھی۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ گویا مجلس میں کسی کو اپنا قدرداں نہیں پاتے اور اس لئے غزل میں فریاد کی کیفیت پیدا ہو گئی غزل تھی:

دل ناداں تجھے ہوا کیا ہے — آخر اس درد کی دوا کیا ہے

(صفحہ ۱۰۰ سے پیوستہ) ایک مرتبہ وظیفہ میں کچھ دیر ہو گئی تو احسانؔ نے عین شکار ماہی کے موقع پر یہ قطعہ فی البدیہہ لکھکر پیش کیا ہے؎

صید ماہی و صید دل شاہا — خوب ہے اور کچھ نہیں معیوب
جال ہو اور شکار مچھلی کا — یعنی ڈوبے کا ہے نکالنا خوب
قطب صاحب تھے جب حضور گئے — وہ دو ماہہ گیا ہے بیڑا ڈوب
اس کو بھی حکم ہو نکل آئے — صبر کب تک ہو میں نہیں ایوب

(۱۵۸) ایک مرتبہ مرزا غالب کو بہادر شاہ نے اپنے کھانے کی بیسنی روٹی بھیجی آپ نے فی البدیہہ یہ لکھکر بھیجا؎ (بقیہ بر صفحہ ۱۰۲)

ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں — کاش پوچھو کہ مدعا کیا ہے

(صفحہ ۱۰۱ سے پیوستہ)

نہ پوچھ اس کی حقیقت حضور والا نے — مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی
نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر — جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

(۲) مولوی فضل حق صاحب جو غالب کے بڑے دوست تھے ایک دن غالب ان کی ملاقات کو گئے۔ ان کی عادت تھی کہ جب کوئی بے تکلف دوست آیا کرتے تو خالق باری کا یہ مصرعہ پڑھا کرتے تھے ؎ بیا برادر آؤ رے بھائی۔
چنانچہ مرزا صاحب کی تعظیم کو اٹھ کھڑے ہوئے اور یہی مصرع کہکر بٹھایا۔ مولوی صاحب کی طوائف دوسرے دالان سے اٹھکر پاس آن بیٹھی۔ مرزا صاحب نے فرمایا ہاں صاحب اب وہ دوسرا مصرع بھی فرما دیجئے ؎
بنشیں مادر بیٹھ ری مائی

مولوی صاحب بہت خفیف ہوئے۔ اس دن سے یہ عادت چھوڑ دی

(۳) حکیم رضی الدین ایک دن مرزا کے پاس ان کے مکان پر بیٹھے ہوئے تھے ان کو آموں سے زیادہ رغبت نہ تھی۔ اتفاق سے ایک گدھے والا اپنے گدھے لئے ہوئے وہاں سے گزرا راستہ میں آم کے چھلکے پڑے ہوئے تھے گدھے نے سونگھ کر چھوڑ دیئے۔ حکیم صاحب نے مرزا صاحب سے کہا "دیکھئے آم ایسی چیز ہے جسے گدھا بھی نہیں کھاتا"
مرزا نے جواب دیا "ہاں گدھا نہیں کھاتا" —(بقیہ بر صفحہ ۱۰۳)—

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود — پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے — نگہہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے

(صفحہ ۱۰۲ سے پیوستہ) (۴) ایک مرتبہ بعد رمضان جب مرزا قلعہ میں گئے تو بادشاہ نے پوچھا "مرزا! تم نے کتنے روزے رکھے" مرزا نے جواب دیا "پیر و مرشد! ایک نہیں رکھا"

(۵) عمائد شہر میں جو لوگ مرزا کے مکان پر آتے تھے وہ بھی ان کے مکان پر ضرور جاتے تھے۔ ایک روز کسی سے مل کر وہ نواب مصطفےٰ خاں کے مکان پر آئے نواب صاحب نے کہا "آپ مکان سے سیدھے آتے ہیں یا کہیں اور بھی جانا ہوا تھا؟ مرزا نے کہا "مجھکو ان کا ایک آنا دینا تھا اس لئے وہاں گیا تھا وہاں سے یہاں آیا ہوں"

(۶) ایک روز میر مہدی مجروح بیٹھے تھے اور مرزا غالب پلنگ پر پڑے کراہ رہے تھے میر مہدی پاؤں دابنے لگے۔ مرزا نے کہا بھئی تم سید زادہ ہو مجھے کیوں گنہگار کرتے ہو۔ انہوں نے نہ مانا اور کہا "آپ کو ایسا ہی خیال ہے تو پاؤں دابنے کی اجرت دے دیجئے گا" مرزا نے کہا "ہاں اس کا مضائقہ نہیں" جب وہ پاؤں داب چکے تو انھوں نے اجرت طلب کی۔ مرزا نے کہا "بھیا کیسی اجرت تم نے میرے پاؤں دابے" میں نے تمہارے پیسے دابے "حساب برابر ہوا"

(۷) شمس العلماء مولانا الطاف حسین حالی نے مرزا صاحب کو یہ شعر پڑھ کر سنایا
حالی۔ عمر شاید نہ کرے آج وفا ❊ سامنا ہے شبِ تنہائی کا
مرزا نے اس پر یوں اصلاح کی۔ (بقیہ ۱۰۴ صفحہ پر)

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں — ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
ہم کو اُن سے وفا کی ہے اُمید — جو نہیں جانتے وفا کیا ہے
ہاں بھلا کر ترا بھلا ہوگا — اور درویش کی صدا کیا ہے
جان تم پر نثار کرتا ہوں — میں نہیں جانتا دعا کیا ہے

(صفحہ ۱۰۳ سے پیوستہ) عمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شب تنہائی کا

دوسرے مصرع میں بجائے "سامنا" کے "کاٹنا" بنا کر شعر کو بلند تر کر دیا۔ اس موقع پر کاٹنا ہی زیادہ پر لطف و معنی خیز ہے کیوں کہ لفظ عمر اور شب دونوں میں مشترک ہے۔ ایک لفظ کے بدلنے سے کس قدر خوبی بڑھ گئی۔

(۸) نواب یوسف علی خاں ناظم والی رام پور کا ایک شعر تھا۔

ناظم آج وہ لے گیا دل چھین کے میرا مجھ سے
جس کو مٹی کے کھلونے پہ مچلتے دیکھا

مرزا صاحب نے یہ اصلاح دی:

دل کے لینے میں یہ قدرت اُسے اللہ نے دی
جس کو مٹی کے کھلونے پہ مچلتے دیکھا

"یہ قدرت اُسے اللہ نے دی" اس اصلاح سے شعر میں معنوی خوبیاں کس قدر ترقی کر گئیں۔ ایک ایک لفظ گویا جواہر کا ٹکڑا ہے۔

(۹) ناظم ۔ گر نہیں تیری کرامت تو یہ کیا ہے ساقی
ہم نے ساغر کو ترے بزم میں چلتے دیکھا (بقیہ ۱۰۵ صفحہ پر)

میں نے مانا کہ کچھ نہیں غالب
مفت ہاتھ آئے تو برا کیا ہے

غزل پڑھکر مسکرائے اور کہا "اس پر بھی نہ سمجھیں وہ تو پھر ان سے خدا سمجھے" حکیم آغا جان سمجھ گئے اور کہنے لگے "مرزا صاحب! غنیمت ہے کہ تم اس رنگ کو آخر ذرا سمجھے" غرض انہیں لنتریوں کے ساتھ ساتھ مذاق بھی ہوتا رہا اور شمع استاد ذوق کے سامنے پہنچ گئی۔ استاد نے مرزا فخرو کی طرف دیکھکر کہا "صاحب عالم! غزل پڑھوں یا کل جو قطعہ ہوا ہے وہ عرض کروں کل رات خدا جانے کیا بات تھی کہ کسی طرح نیند ہی نہیں آتی تھی لیٹے لیٹے صبح ہو گئی۔ شب بھر اس کا ساعرہ آ گیا اسی کش مکش میں ایک قطعہ ہو گیا۔ اجازت ہو تو عرض کروں" مرزا فخرو نے کہا "استاد آج کا مشاعرہ سب بندوں سے آزاد ہے۔ غزل پڑھئے، رباعی پڑھئے قطعہ پڑھئے، غرض جو دل چاہے پڑھئے، ہاں کچھ نہ کچھ پڑھئے ضرور" استاد ذوق سنبھل کر بیٹھ گئے اور یہ قطعہ ایسی بلند اور خوش آیند آواز میں

(۱۰۴ صفحہ سے پیوستہ) اصلاح غالب: ہے یہ ساقی کی کرامت کہ نہیں جام کے پاؤں
اور پھر سب نے اسے بزم میں چلتے دیکھا

سبحان اللہ! ساقی کی کرامت کا کیا بدیہی ثبوت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جام کے پاؤں نہیں اور پھر سب نے اسے بزم میں چلتے دیکھا۔ بغیر پاؤں کے چلنا ناممکن تھا مگر یہ ساقی کی کرامت ہے کہ بزم میں جام بے پاؤں کے چل رہا ہے۔

(۱) ذوق مرحوم نے ایک مشاعرے میں "چال کے" "دو نکال کے" اس طرح میں غزل پڑھی، ان کے استاد شاہ نصیر بھی موجود تھے مطلع یہ تھا

(بقیہ ۱۰۶ صفحہ پر)

پڑھا کہ محفل گونج اٹھی اور ان کے پڑھنے کے انداز نے کلام کی تاثیر میں اور زیادہ زور پیدا کر دیا:

کہوں کیا ذوقؔ احوالِ شبِ ہجر ۔۔۔ کہ تھی اک اک گھڑی سو سو مہینے
نہ تھی شب ڈال رکھا تھا اک اندھیر ۔۔۔ مرے بختِ سیاہ کی تیرگی نے
تپِ غم شمع ساں ہوتی نہ تھی کم ۔۔۔ اور آتے تھے پسینوں پر پسینے
یہی کہتا تھا گھبرا کر فلک سے ۔۔۔ کرا دیے مہر، بدا ختر، کمینے
کہاں میں اور کہاں یہ شب مگر تھے ۔۔۔ مری جانب سے تیرے دل میں کینے

(۱۰۵ صفحہ سے پیوستہ) نرگس کے پھول بھیجے ہیں ٹبوے میں ڈال کے
ایما یہ ہے کہ بھیجدے آنکھیں نکال کے

ان کے استاد نے فرمایا میاں ذوقؔ پھول بٹوے میں نہیں ہوتے یوں کہو ع
"نرگس کے پھول بھیجے ہیں دونے میں ڈال کے"

ذوقؔ نے کہا حضرت گستاخی معاف دونے میں رکھنا ہوتا ہے۔ ڈالنا نہیں ہوتا مناسب یوں ہوگا ؎ بادام دو جو بھیجے ہیں بٹوے میں ڈال کے
ایما یہ ہے کہ بھیجدے آنکھیں نکال کے

(۳) ایک دن ایک شخص نے ذوقؔ سے کہا کہ میرے ایک دوست کا نام غلام علی اور باپ کا نام غلام محمدؐ ہے۔ آپ اس پر ایسا سجع لکھدیں کہ جس میں دونوں نام آجائیں آپ نے یہ سجع لکھکر حوالہ کیا: "پدر غلام محمدؐ پسر غلام علی"

بقیہ ۱۰۷ صفحہ پر

سوا اس ظلمت کے پردے میں کیے ظلم ٭ ارے ظالم تری کینہ وری نے
عوض کس بادہ نوشی کے مجھے آج ٭ پڑے یہ زہر کے سے گھونٹ پینے
حواس ہوش جو مجھ سے قریں تھے ٭ قرینے سے ہوئے سب بے قرینے
مری سینہ زنی کا شور سن کر ٭ پھٹے جاتے تھے ہمسایوں کے سینے
اٹھایا گاہ اور گاہے بٹھایا ٭ مجھے بے تابی و بے طاقتی نے
کہا جب دل نے تو کچھ کھا کے سو رہ ٭ بہت الماس کے توڑے نگینے
نہ ٹوٹا جان کا قالب سے رشتہ ٭ بہت سی جان توڑی جاں کنی نے

(صفحہ ۱۰۶ سے پیوستہ) (۳) ایک دفعہ مشاعرہ میں حکیم آغا جان عیش نے اپنی غزل کا یہ شعر پڑھا ؎ اے شمع صبح ہوتی ہے روتی ہے کس لیے ٭ تھوڑی سی رہ گئی ہے اسے بھی گزار دے

ان کے بعد ہی ذوق کی باری تھی انھوں نے یہ پڑھا ؎

اے شمع تیری عمر طبیعی ہے ایک رات ٭ رو کر گزار یا اسے ہنس کر گزار دے

(۴) ایک دن بیٹھے بیٹھے نہ جانے کیا خیال آیا حافظ ویران بیٹھے ہوئے تھے فرمایا کہ میاں ویران تئیس برس کی مشق کے بعد آج اصلاح دینی آگئی ہے۔ ویران نے پوچھا کیوں کر؟ کہنے لگے کہ ایک مرتبہ شاہ نصیر کسی شاگرد کو اصلاح دے رہے تھے اس غزل کا ایک مصرع یہ تھا ؎ "کھاتی کمر ہے تین بل اک گدگدی کے ساتھ"
ابتدائے مشق تھی اتنا خیال میں آیا کہ یہاں کچھ اور ہونا چاہیے آج وہ نکتہ حل ہو گیا ویران نے دریافت کیا کہ حضرت پھر کیا؟ ——(بقیہ صفحہ ۱۰۸ پر)——

بہت دیکھا نہ دکھلایا ذرا بھی ‖ طلوعِ صبح سے منہ روشنی نے
کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات ‖ یقیں تھا صبح تک سے گی نہ جینے
لگے پانی چوانے منہ میں آنسو ‖ پڑھی لیسین سرہانے بیکسی نے
مگر دن عمر کے تھوڑے سے باقی ‖ لگا رکھے تھے میری زندگی نے
مگر قسمت سے قریبِ خانہ میرے ‖ اذاں مسجد میں دی ہائے کسی نے
بشارت مجھکو صبحِ وصل کی دی ‖ اذاں کے ساتھ ہی فرخی نے
ہوئی ایسی خوشی اللہ اکبر ‖ کہ خوش ہو کر کہا یہ خود خوشی نے

(صفحہ ۷۰ سے پیوستہ) فرمایا مگر کو اوپر ڈال دو عرض کی کیوں کر؟ کہا یہ مصرع لگا دو۔

بل ہے مگر کہ زلفِ مسلسل کے پیچ میں ❊ کھاتی ہے تین تین بل اک کدگدی کے ساتھ

(۵) مرزا جواں بخت بہادر شاہ ظفر کے بیٹے تھے جب ان کی شادی کا موقع آیا تو بڑی دھوم کے سامان ہوئے۔ غالب نے سہرا لکھکر حضور میں گزرانا جس کا مقطع یوں لکھا تھا ؎

ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں ❊ دیکھیں اس سہرے سے کہدے کوئی بہتر سہرا

مقطع کو سن کر بادشاہ کو خیال ہوا کہ اس میں ہم پر چشمک ہے گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس سہرے کے برابر کوئی سہرا کہنے والا نہیں ہے ہم نے جو ذوق کو استاد اور ملک الشعرا بنایا ہے یہ سخن فہمی سے بعید ہے بلکہ طرفداری ہے چنانچہ اسی دن ذوق بادشاہ کے حضور میں جو گئے تو بادشاہ نے وہ سہرا دیا کہ استاد اسے دیکھئے۔ انھوں نے پڑھا اور بموجب عادت کے عرض کی پیر و مرشد درست۔ بادشاہ نے کہا کہ استاد تم بھی ایک کہدو عرض کی بہت خوب۔ پھر فرمایا کہ

(بقیہ ۱۰۹ صفحہ پر)

موذن مرحبا بروقت بولا
تری آواز مکّے اور مدینے

آخری شعر پر پہنچے تھے کہ برابر کی مسجد سے آواز آئی "اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر" اس کے ساتھ ہی سب کے منھ سے نکلا "تری آواز مکّے اور مدینے" اذان ختم ہوئی تو سب نے دعا کو ہاتھ اٹھائے۔ دعا سے فارغ ہو کر مرزا فخرو نے کہا۔ صاحبو! کچھ عجیب اتفاق ہے کہ فاتحہ خیر ہی سے یہ مشاعرہ شروع ہوا تھا اور اب فاتحہ خیر ہی پر ختم ہوتا ہے یہ کہکر انھوں نے دونوں شمعوں کو جو جھک کر ان کے سامنے آگئی تھیں بجھا دیا۔ شمعوں کے گل ہوتے ہی نقیبوں نے آواز دی "حضرات! مشاعرہ ختم ہوا" یہ سننا تھا کہ چلنے کو سب کھڑے ہو گئے سب سے پہلے مرزا فخرو سوار ہوئے اور پھر سب ایک ایک کر کے رخصت ہوئے آخر میں میں اور نواب زین العابدین خاں رہ گئے ہیں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ کہنے لگے "میاں کریم الدین، یہ تمہاری نیک نیتی تھی جو اتنا بڑا مشاعرہ بخیر و خوبی ختم ہوا۔ تمہارا کام بھی بن گیا اور میرا ارمان بھی نکل گیا۔ اچھا خدا حافظ"

(صفحہ ۱۰۸ سے پیوستہ) ابھی لکھ دو اور ذرا مقطع پر نظر رکھنا۔ ذوق وہیں بیٹھ گئے اور سہرا لکھا۔ آخر کا شعر مقطع کے جواب میں اس طور سے لکھا ؎

جس کو دعویٰ ہے سخن کا یہ سنا دو اس کو
دیکھو اس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

شاعری کی حقیقت

(از احسن مارہروی)

الا یا ایہا الشاعر اسنادہ نظمِ روح افزا | کہ پائیں جس میں کیفیت مثالِ نشۂ صہبا
تکلم شعر کا ہو ہمنوائے قلقلِ مینا | بنے دروازۂ مے خانہ ہر اک مصرعِ زیبا

صدائے شعر خوانی سربسر رندوں کی ہو حق ہو
مخالف مے کدے سے محفلِ معنی نہ مطلق ہو

نشست اس طرح لفظوں کی ہو جیسے مجمعِ رنداں | دوائر حرفوں کے مانند جام و شیشہ و فنجان
جو کاغذ قابلِ صافی تو نقطے کاگ کے شایاں | مدد یا ساقی کوثر اچھا ہو یہ سب ساماں

مزا آئے شرابِ کہنہ کا اس تازہ پانی میں
چلائیں کشتیٔ مے ہم طبیعت کی روانی میں

شرابِ کہنہ کیا؟ یعنی پرانی شاعری جس پر | نئی تہذیب والے معترض ہوتے ہیں یہ کہہ کر
گل و بلبل کے افسانے وصال و ہجر کے دفتر | ہوئے بوسیدہ و پارینہ ان کو چھوڑ دو یکسر

بعد تکرار کیوں بے کار یہ اذکار مبہم ہیں
نیا منظر نئی باتیں نئے مضموں کیا کم ہیں

یہ کہنا ایک حد تک نوجوانوں کا بہت سچ ہے | قدیم اشعار ہیں آخور کی بھرتی کچا کچھ ہے
اب ان باتوں میں کیا رکھا ہے بے کار ان کا لالچ ہے | نہیں جو قابلِ تسلیم کیوں اس بات کی پچ ہے

بعینہٖ بس یہی حالت ہے تکرارِ خیالی میں
مویشی منہ چلایا کرتے ہیں جیسے جگالی میں

مگر باایں ہمہ بے کار یہ فن ہو نہیں سکتا | لگا کر آنکھ اس سے کوئی غافل سو نہیں سکتا
شناور قلزمِ معنی کا نیچے سر ڈھو نہیں سکتا | اگر چاہے تو شاعر وقت اپنا کھو نہیں سکتا

ہر اک رنگِ سخن مجموعۂ نیرنگ مضموں ہے
مذاقِ شعر بے شک نعمتِ خلاقِ بیچوں ہے

سنیں سب اشاعری کیا چیز ہے کیا کرتی دھرتی ہے
یہ اس کا کام ہے کوزے میں اک دریا کو بھرتی ہے
جو شے آتی ہے اس کے قبضے میں وہ کب بکھرتی ہے
کہ ساری منتشر چیزوں میں پیدا میل کرتی ہے

نتیجے میں کے جو کچھ بھی ہوتے ہیں وہ ظاہر ہیں
سمجھتے ہیں حقیقت خوب اس کی جتنے ماہر ہیں

یہ ہے فنِ لطیف اک ذی خرد نقاش کی صورت
چھپاتی ہے انھیں چیزوں کو ہوتی ہیں جو بدہیئت
بری ہیں جو نظر میں ہے انھیں سے دل کو بھی نفرت
جنھیں تو شاعری سے ہوتی ہے مانوس اک خلقت

نہ کیوں کر شاہدِ معنیٰ ہو یکتا حسن صورت میں
نہاں اک نور کا پتلا ہے شاعر کی طبیعت میں

کمندِ شاعری کو فلک کیا ہے گر بلندی ہے
کہ اس کی پستیِ مضمون میں بھی مضمر بلندی ہے
زوالِ شاعری یہ ہے کہ پستی ہر بلندی ہے
کمالِ شاعری یہ ہے بلندی سربلندی ہے

وہی شاعر ہے جو اک رائی کو پربت بناتا ہے
مجازی صورتیں رنگِ حقیقت میں دکھاتا ہے

مجاز اور استعارے سے عبث کوئی بگڑتا ہے
کوئی کانٹا نہیں تشبیہ ناحق دل کھٹکتا ہے
مگر راہِ عدم بھی ہو تو کب رہرو کھٹکتا ہے
یہیں کیفِ سخن آتا ہے ناصح کیوں بہکتا ہے

مزا ملتا ہے ان باتوں میں ان کو جو سخنور ہیں
مرصع کاریاں سب شاہدِ معنیٰ کا زیور ہیں

خلافِ فطرت ان باتوں کو کہنا نامناسب ہے
کہ یہ فن مقتدر ہے اس کا ماہر ذی مناصب ہے
عطیہ ہے یہ وہبی، قدرتی ہر ایک کا سب ہے
کہے گا تو زائد وہ نہ اس کو جو محاسب ہے

ہماری شاعری فعلِ عبث ہرگز ہو نہیں سکتی

بدی کا بیج گلزارِ سخن میں بو نہیں سکتی

خدا نے آدمی کو اصل میں پیدا کیا عریاں — طریقہ ستر پوشی سے بھی تھا واقف وہ نا
ہوئے عقل و خرد سے جب مکمل حضرتِ انساں — تو ٹوپی کرتہ پاجامہ سبھی کچھ بن گیا سا

یہ ساماں جو بنایا ہے بگاڑا جا نہیں سکتا
نہ ہو جب تک لباس گرم جاڑا جا نہیں سکتا

یہی سب رنگ ہیں تشبیہ ہیں اور استعارے ہیں — انھیں سے دل کشی ہے حسن معنی کے نظارے ہیں
صراحت کا مزا یہ ہے کہ سب پر آشکارے ہیں — غرض جو کچھ کہا کم ہے وہ اس صنعت کے

تصنع سے تنفر سادہ لوحی کی نشانی ہے
کہ صانع ازل اس طرز کا بانی مبانی ہے

مگر ہاں وہ تصنع ہے جو ہم صنائع مکاری — بلا شک قابل نفرت ہے چھوڑو لغو گفتار
یہ بیہودہ سرائی ختم ہونی چاہیے ساری — اسی پر غیر ہنستے ہیں یہی ہے باعث

لباس اچھا پہننا چاہیے مردی وجاہت کو
تباہ سانگ بھر کر تم نہ اصلی شکل صورت کو

بہت افراط و تفریط ان دونوں میں ہے ہر طرف ظاہر — اب ان میں ایشیائی ہوں کہ ہوں
نہ باتیں ان کی سب بد تر نہ اقوال ان کے سب نادر — کہیں مجبور ہے کوئی کہیں کوئی نہیں قا

جو باتیں صاف سچی ہوں انھیں کیا کوئی جھٹلائے
یہ ناممکن کہ خاک اڑنے سے نورِ مہر چھپ جائے

بڑی وہ سادگی جس میں ہو شانِ جامہ عریانی — وہ کیا گل کاریاں جن میں ہو گندی عطر
نہ بہتر وہ کمی حد کی نہ اچھی یہ فراوانی — مگر ہو اعتدال ایسا نہیں جس کا کہیں

روش اچھی ہے یہ سب کا یہی دستور ہو جائے
دعا ہے سعی احسن یا خدا مشکور ہو جائے